ماہنامہ "الرسالہ" دہلی کی ایک گمراہ کن تحریر بنام "فتنہ دہیما: فکری کنفیوژن"
جس میں علم فقہ کو فتنہ قرار دیا گیا ہے کا رد

# کیا علم فقہ فتنۂ سیاہ ہے؟


مصنف

محمد شہباز انور برکاتی

اتر دیناج پور (بنگال)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

''وَ اِذَا قُلۡتُمۡ فَاعۡدِلُوۡا وَ لَوۡ کَانَ ذَا قُرۡبٰی'' (القرآن)

(جب بات کہو تو انصاف کی بات کہو اگرچہ تمھارے رشتہ دار ہی کا معاملہ ہو)

ماہنامہ ''الرسالہ'' دہلی کی ایک گمراہ کن تحریر بنام
''فتنۂ دہیما: فکری کنفیوژن'' جس میں علم فقہ کو
فتنہ قرار دیا گیا ہے کا ردّ

# کیا علم فقہ
# فتنۂ سیاہ ہے؟


از

## محمد شہباز انور برکاتی

اتر دیناج پور (بنگال)
متعلم جامعہ اشرفیہ مبارک پور اعظم گڑھ



ناشر

## ادارۂ فلاح

بیدول کٹیہار (بہار) پن کوڈ ۸۵۴۳۱۷

| | | |
|---|---|---|
| نام کتاب | : | کیا علم فقہ فتنۂ سیاہ ہے ؟ |
| مصنف | : | محمد شہباز انور برکاتی |
| نظر ثانی | : | مبلغ اسلام مولانا عبدالمبین نعمانی مصباحی |
| پروف ریڈنگ | : | روح الامین برکاتی |
| کمپوزنگ | : | کمال احمد عطاری |
| صفحات | : | ۷۹ |
| سن اشاعت | : | محرم الحرام ۱۴۳۸ھ (باراوّل) |
| ناشر | : | ادارۂ فلاح، بیدول کٹیہار (بہار) |
| بتعاون | : | ڈاکٹر محمد مکرم رضا، ڈاکٹر محمد معظم رضا، ڈاکٹر انیس الرحمٰن اور انجینئر محمد کاشف رضا۔ |
| قیمت | : | ۵۰/ روپیے |


## ملنے کے پتے:


- ادارۂ فلاح، بیدول کٹیہار (بہار) فون: 8009451892
- مکتبہ حافظ ملت، انصاری مارکیٹ مبارک پور اعظم گڑھ
- المجمع الاسلامی ملت نگر مبارک پور اعظم گڑھ
- کمال بکڈپو گھوسی مئو


**Email:** thfalah@gmail.com

# فہرست

# پیش لفظ

گزشتہ چند سالوں سے اہل اسلام پر اقتصادی اور ملی اعتبار سے جو پابندیاں اور سختیاں عائد ہوتی چلی جارہی ہیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں، مزید برآں بدمذہبوں کی فرزندان توحید کے ایمان وعقائد پر غارت گری بھی مخفی نہیں کہ انھوں نے قرطاس وقلم، خطابت اور انفرادی کوشش نیز جدید ذرائع ابلاغ مثلاً سوشل میڈیا کے ذریعے اپنے فاسد افکار ونظریات کی نشرواشاعت میں کوئی کسر باقی نہ رکھی، ایسے پر آشوب دور میں علماے اسلام کی دینی اور مذہبی تقاضوں سے پہلوتہی یقیناً قابل افسوس ہے۔

ہاں! دیکھا جائے تو انفرادی کوشش اور سوشل میڈیا کے ذریعے تحریک **دعوت اسلامی** اور دیگر سنی تنظیموں کے افراد تلافی مافات کی بھرپور کوشش کررہے ہیں۔ خطابت کے میدان میں بھی چند مخلص حضرات اپنے فریضے انجام دے رہے ہیں لیکن بیشتر مقررین نے خطابت کو محض ذریعۂ معاش سمجھ رکھا ہے جس کا لازمی نتیجہ ظاہر وباہر ہے۔

مگر گمراہ کن تحریروں پر قدغن لگانے اور تحریری طور پر دنداں شکن جواب دینے کے لیے کوئی مرد میداں کمربستہ نظر نہیں آتا، خصوصاً **رئیس القلم علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ** کے بعد تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اپنے دینی فریضوں کی فہرست سے اس اہم فریضے کو خارج ہی کردیا ہے، ہر ایک اسے دوسرے کی ذمہ داری سمجھ کر تساہلی کے ایسے شکار ہیں کہ سارے قلم خاموش نظر آرہے ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ آج ہند وپاک بلکہ پوری دنیاے اسلام میں ایک دو نہیں، ہزاروں گمراہ کن تحریریں گردش کررہی ہیں جن کا خمیازہ ساری امت کو بھگتنا پڑرہا ہے۔

زیر نظر کتاب "کیا علم فقہ فتنۂ سیاہ ہے؟" ماہنامہ "الرسالہ" (دہلی سے شائع ہوتا ہے اور اس کے ایڈیٹر **وحید الدین خاں** ہیں) کے ایک مضمون بنام "فتنۂ دہیما: فکری کنفیوژن" کا تنقیدی جائزہ ہے۔

وجہ تصنیف کچھ اس طرح ہے کہ میرے خالو **ڈاکٹر انیس صاحب** "الرسالہ" کے مستقل قاری ہیں۔ جب بھی میں ان کے یہاں جایا کرتا ہوں تو اختلافی باتیں چھڑ جاتی ہیں پھر بڑی سنجیدگی سے ان کے شبہات کو دلائل وبراہین سے زائل کرنے کی بھرپور کوشش کرتا

ہوں۔ ماہ ذوالحجہ ۱۴۳۷ھ کی بات ہے کہ جب میں ان کے یہاں اس بار گیا تو انھوں نے الرسالہ ماہ اگست سے مذکورہ مضمون نکال کر مجھے پڑھنے کے لیے دیا جس میں بہت سی صریح غلطیاں موجود تھیں۔ میں نے فوری طور پر کچھ غلطیوں کی نشاندہی کی اور دلائل سے انھیں آشکارا کیا، چوں کہ الرسالہ دو زبانوں؛ انگریزی، اردو میں شائع ہوکر محض ایک ڈاکٹر انیس ہی تک نہیں پہنچتا بلکہ ہزاروں افراد اس کی ملمع سازیوں پر فریفتہ ہیں۔ اس لیے میں نے اپنی اس کاوش کو امت مسلمہ کی بارگاہ میں تحفۂ نجات کے طور پر پیش کیا۔

اس رسالے کا مسودہ متعدّد مشاغل کے باوجود ۱۴ر دن یعنی ۸ تا ۲۱ر اکتوبر ۲۰۱۵ء کے مختصر وقفے میں تیار ہو چکا تھا لیکن مشیت الٰہی کہ آج ایک سال سے زائد عرصہ گزرنے کے باوجود بھی منظر عام پر نہ آسکا، تاہم اس طویل عرصے میں وقتاً فوقتاً ترمیم و اضافے کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ بہر حال ''دیر آید درست آید'' کہ اب یہ جائزہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

میری اس کاوش کا سہرا واقعتاً اگر کسی کے سر جاتا ہے تو وہ والدین کی آہ سحر گاہی، حافظ ملت کا روحانی فیضان اور میرے مشفق اساتذہ کی مقدس جبینیں ہیں ـــ اس موقع پر میں سب سے زیادہ احسان مند **مبلغ اسلام شاگرد حافظ ملت مولانا محمد عبد المبین نعمانی مصباحی** کا ہوں جنھوں نے باوجود مصروفیت اپنے قیمتی اوقات میں سے کچھ اس رسالے کی نظر ثانی میں صرف فرمایا۔ ساتھ ہی جامعہ اشرفیہ کے ناظم تعلیمات **علامہ محمد احمد مصباحی** دام ظلہ العالی کا بھی شکر گزار ہوں جنھوں نے کتاب کا نام تجویز فرمانے کے ساتھ کتاب کی تزئین سے متعلق مفید مشوروں سے نوازا۔ اور جامعہ اشرفیہ کے موقر استاذ **علامہ صدر الوریٰ مصباحی** کا بھی ممنون ہوں جن کے حوصلہ کن جملوں نے مجھے اس کار خیر پر آمادہ کیا اور میرے حوصلوں کو بام عروج تک پہنچایا۔ نیز ڈائریکٹر **ادارۂ فلاح محمد کامل رضا مصباحی** کا شکر گزار ہوں جنھوں نے اس کتاب کی اشاعت فرماکر ہماری حوصلہ افزائی کی۔ اللہ ان کی تنظیم کو عام و خاص میں مقبول کرے۔

بڑی ناسپاسی ہوگی اگر میں اپنے محب و مکرم کمال احمد عطاری کا ذکر نہ کروں جنھوں نے اس کتاب کی کمپوزنگ میں فی سبیل اللہ اپنے اوقات صرف کیے، نیز اپنے ان احباب کا ذکر بھی مناسب سمجھتا ہوں جنھوں نے اس کتاب کی پروف ریڈنگ کی یا کسی بھی حیثیت سے

اپنا تعاون پیش کیا مثلاً میرے ابن عم روح الامین برکاتی اور مولانا عبدالحق مصباحی وغیرہ۔
اخیر میں اللہ رب العزت کی بارگاہ میں دعا ہے کہ میری اس کاوش کو قبول فرمائے اور مسلمانوں کے عقائد کی حفاظت کا سبب اور میرے لیے ذریعۂ نجات بنائے۔ واللہ الموفق بکل خیر و دافع کل الضیر.

محمد شہباز انور برکاتی عفی عنہ
۹؍ محرم الحرام ۱۴۳۸ھ
مطابق ۱۱؍ اکتوبر ۲۰۱۶ء
شب سہ شنبہ

# تقریب

## از مبلغ اسلام، شاگرد حافظ ملت حضرت مولانا عبد المبین نعمانی مصباحی مدظلہ العالی

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

نحمده ونصلي ونسلم على رسوله الكريم
وآله وصحبه أجمعين

زیر نظر کتاب **"کیا علم فقہ فتنۂ سیاہ ہے؟"** ماہنامہ **"الرسالہ"** کے ایک گمراہ کن مضمون کا تنقیدی جائزہ ہے۔ الرسالہ کے ایڈیٹر جناب وحید الدیں خاں ہیں جو دہلی میں ایک مرکز بنا کر اپنے غلط افکار و نظریات کی ترسیل کا کام بڑی تیزی سے کر رہے ہیں۔ عام قاری آسانی سے ان کی تحریروں کے فساد کو محسوس نہیں کر پاتا جس کی وجہ سے ان کی گمراہی عام ہوتی جا رہی ہے۔ چکنی چپڑی باتوں میں موہ لینے کا فن موصوف خوب جانتے ہیں اور خود مدعی ہیں کہ ہم اسلام کو اس کی اصلی شکل میں پیش کرنا چاہتے ہیں، گویا اب تک جو اکابر و اسلاف اسلام کو پیش کر رہے تھے اور آج بھی اہل اسلام اسی پر چل رہے ہیں وہ ان کی نظر میں اصلی اور صحیح اسلام نہیں، حالاں کہ اہل علم اچھی طرح واقف ہیں کہ وہ اسلام کی اصلی شکل کو مسخ کر کے دنیا کو دکھانا اور اس پر چلانا چاہتے ہیں۔ بدقسمتی سے مسلمانوں کا عام طبقہ چاہے وہ پڑھا لکھا ہو یا ناخواندہ، اسلامی عقائد و مسائل سے ناواقف ہی نظر آتا ہے، بہت کم لوگ اسلام کو صحیح طریقے سے سیکھنے، سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کا سچا جذبہ رکھتے ہیں۔ بس یہی لوگ شکوک و شبہات کا شکار ہو جاتے ہیں اور غلط راہ پر لگ جاتے ہیں۔

ابھی حالیہ دنوں میں مدیر **الرسالہ** نے **"دہیما"** کے فتنے کو عنوان بنا کر ایک ایسی تحریر شامل الرسالہ کی ہے جس نے اسلام کے بہت سے بنیادی عقائد و مسائل کی غلط تصویر پیش کر کے رکھ دی ہے۔

وحید الدین خاں صاحب کا مذہب و مسلک کیا ہے مجھے آج تک سمجھ میں نہیں آسکا، بہت غور کرنے کے بعد ایسا لگا کہ آپ ایک آزاد فکر کے حامل آدمی ہیں جو انھیں سمجھ میں آتا ہے اسی کو وہ اپنا مذہب بنا لیتے ہیں اور اسی کا نام اسلام رکھتے ہیں، الرسالہ کے ذریعے آں

جناب مسلسل گمراہ کن مواد لوگوں کے سامنے پیش کررہے ہیں اس لیے ان کے غلط افکار و نظریات کا رد بہت ضروری ہے، یہ جوابی تحریر بھی اسی کی طرف ایک قدم ہے۔

اس فتنے کا ایک حدیث پاک میں ذکر ہے جس کی تفصیل آگے اصل کتاب میں آئے گی۔ حدیث دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ابھی وہ فتنہ بہت دور ہے لیکن وحید الدین خاں صاحب نے بہت پہلے (دور تابعین میں) ہی بلا رکھا ہے۔ اصل میں وہ اپنا کمال دکھانا چاہتے ہیں کہ جو بات اوروں کو آج تک سمجھ میں نہیں آئی اس کو صرف میں نے اچھی طرح سمجھا ہے۔

حدیث رسول کی غلط تشریح اور اس میں معنوی تحریف دیکھ کر مولانا وحید الدین خاں کی علمیت پر سوال کھڑا ہو گیا ہے کہ آخر موصوف اتنے نادان کیسے بن گئے؟ یہ تو ایک مثال ہے، اس قسم کے کتنے مسائل ہیں جنھیں موصوف نے توڑ مروڑ کر پیش کرنے کی سعی ناپاک کی ہے۔

**متن حدیث کا خلاصہ ملاحظہ ہو:**

ایک مرتبہ سرکار دوجہاں ﷺ نے مجلس صحابہ میں کثرت سے فتنوں کا ذکر فرمایا اور سب سے پہلے ”فتنۂ اَحلاس“ اور اخیر میں ”فتنۂ دہیما“ کا ذکر فرمایا کہ فتنۂ دہیما امت کے ہر فرد کو اپنی زد میں لے لے گا اور اس قدر تباہ کن ہوگا کہ اسلام کی حالت میں صبح کرنے والا شخص اس کے شر سے متاثر ہو کر شام تک کافر ہو جائے گا، پھر لوگ دو جماعتوں میں بٹ جائیں گے؛ ایک اہل ایمان کی جماعت جس میں نفاق نہیں اور دوسری منافقوں کی جس میں ایمان نہیں ہوگا۔ پھر حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب ایسا ہو جائے تو اسی دن دجال کا انتظار کرو یا اس کی صبح۔ (سنن ابی داؤد: کتاب الفتن ص: ۴۲۴۲)

حدیث پاک کے ظاہر ہی سے یہ بات واضح ہے کہ فتنۂ دہیما قیامت سے انتہائی قریب واقع ہوگا کیوں کہ دجال کا خروج انتہائی قرب قیامت کی نشانیوں میں سے ہے لیکن مولانا وحید الدین نے علم فقہ کو فتنۂ دہیما قرار دے کر اسے دور صحابہ و تابعین جو کہ خیر القرون ہے اسی میں لا دھمکایا۔ زیر نظر کتاب میں مصنف نے مولانا کے اسی نظریے کی تردید کی ہے۔ اور اس راہ میں وحید الدین صاحب نے جو ٹھوکر کھائی ہے اس کی مصنف نے اچھی طرح خبر لی ہے۔

چوں کہ مدیر الرسالہ نے اجتہاد اور مجتہدین نیز علم فقہ کا بھی خوب مذاق اڑایا ہے، امت مسلمہ جس پر صدیوں سے متفق ہے، چناں چہ اس پر بھی مصنف نے بھرپور روشنی ڈالی ہے، اجتہاد و تقلید پر بھی ضروری بحث پیش کر دی ہے۔ اس لیے اس کتاب کو پھیلانا ضروری ہے۔

دیگر علمائے کرام سے اپیل ہے کہ **الرسالہ** کے گمراہ کن مواد پر کڑی نظر رکھیں اور اس کے غلط مندرجات کا ردّ ضرور کریں تا کہ لوگ گمراہ ہونے سے بچیں۔

**مولانا شہباز انور برکاتی** نے اس سلسلے میں جو کوشش کی ہے اللہ تعالیٰ قبول فرمائے اور قارئین کے لیے ذریعۂ نجات و ہدایت بنائے۔ آمین

**محمد عبدالمبین نعمانی قادری**

مہتمم دار العلوم قادریہ، چریاکوٹ، مئو (یوپی)

۲۸/ ذی قعدہ ۱۴۳۷ھ مطابق یکم ستمبر ۲۰۱۶ء

# مقدمۂ اولیٰ

حدیث پاک میں ہے: ”من یر د اللہ به خیرًا یفقهه في الدین“ یعنی اللہ رب العزت جس سے بھلائی کا ادارہ فرماتا ہے اسے دین کا فقیہ بناتا ہے۔[1]

**علم فقہ کیا ہے؟** علم فقہ قرآن و حدیث ہی کا ماحصل ہے چوں کہ قرآن و حدیث کو ہر شخص بلا واسطہ نہیں سمجھ سکتا اس لیے کہ ان میں کچھ احکام منسوخ ہوتے ہیں اور ان کے مقابل کچھ ناسخ احکام ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: «مَا نَنۡسَخۡ مِنۡ اٰیَۃٍ اَوۡ نُنۡسِهَا نَاۡتِ بِخَیۡرٍ مِّنۡهَاۤ اَوۡ مِثۡلِهَا ؕ»[2] یعنی جب کوئی آیت ہم منسوخ فرمائیں یا بھلادیں تو اس سے بہتر یا اس جیسی لے آئیں گے۔

اس کی متعدّد مثالیں قرآن پاک میں ہیں کہ پہلے کسی چیز کا حکم تھا پھر مدت متعیّنہ کے بعد وہ حکم منسوخ ہوگیا۔ اس کی ایک مثال ذیل میں ملاحظہ کریں:

**منسوخ آیت کریمہ:** وَ الَّذِیۡنَ یُتَوَفَّوۡنَ مِنۡکُمۡ وَ یَذَرُوۡنَ اَزۡوَاجًا ۚۖ وَّصِیَّۃً لِّاَزۡوَاجِهِمۡ مَّتَاعًا اِلَی الۡحَوۡلِ غَیۡرَ اِخۡرَاجٍ ۚ[3] یعنی تم میں سے جو مریں اور بیویاں چھوڑ جائیں وہ اپنی عورتوں کے لیے سال بھر تک نان و نفقہ دینے کی وصیت کر جائیں۔ (ان کو گھر سے) نکالے بغیر۔

**ناسخ آیت کریمہ:** وَ الَّذِیۡنَ یُتَوَفَّوۡنَ مِنۡکُمۡ وَ یَذَرُوۡنَ اَزۡوَاجًا یَّتَرَبَّصۡنَ بِاَنۡفُسِهِنَّ اَرۡبَعَۃَ اَشۡهُرٍ وَّ عَشۡرًا ۚ[4] یعنی اور تم میں جو مریں اور بیویاں چھوڑ جائیں تو وہ (بیویاں) چار مہینے دس دن اپنے آپ کو روکے رکھیں۔

مذکورہ بالا دونوں آیتوں میں پہلی آیت دوسری آیت سے اس طرح منسوخ ہے کہ پہلی آیت کریمہ افادہ کر رہی ہے کہ شوہر کی وفات کے بعد اس کی بیوی کو اس کے مال سے ایک سال تک نان و نفقہ ملے گا جب کہ دوسری آیت کریمہ نے اسے منسوخ کرتے ہوئے بتایا کہ

(۱)- صحیح البخاری کتاب العلم ج: ۱، ص: ۱۶

(۲)- البقرۃ: ۱۰۶

(۳)-البقرۃ: ۲۴۰

(۴)-البقرۃ: ۲۳۴

اس کی بیوی صرف چار مہینے دس دن تک ہی نان و نفقہ پائے گی۔ رہی بات یہ کہ پہلی آیت کریمہ سے ثابت ہوتا ہے کہ شوہر کو اپنی وفات سے پہلے اپنی بیوی کے لیے مال کی وصیت کر دینی چاہیے یہ حکم بھی آیت میراث (سورۃ النساء، پ:۴) سے منسوخ ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے متوفیٰ عنھا زوجھا (وہ عورت جس کا شوہر مر گیا ہو) کے لیے متوفیٰ کے ترکے (میت کے چھوڑے ہوئے مال) سے حصہ مقرر کر دیا ہے (یعنی عورت کو چوتھائی مال ملے گا اگر شوہر کے بچے نہ ہوں اور اگر بچے ہوں تو آٹھواں حصہ ملے گا) تو اب اس کے حق میں وصیت جائز نہیں۔ اور رہا ایک سال تک سکنیٰ یعنی رہائش گاہ کی فراہمی کا مسئلہ تو یہ بھی حدیث ''لا سکنیٰ'' سے منسوخ ہو گیا۔ تو ایک عام آدمی کو قرآن کے ان رموز و اسرار کے بارے میں کیا معلوم ہو سکتا ہے؟ ان کو سمجھنے کے لیے کمال علم کے ساتھ توفیق الٰہی کی بھی ضرورت ہے ورنہ سب کے بس کی بات نہیں۔

یوں ہی قرآن سمجھنے کے لیے حدیث کی ضرورت پڑتی ہے کیوں کہ حدیث رسول قرآن عظیم کی بہترین تفسیر ہے اور چوں کہ اس میں بھی کچھ احکام منسوخ اور کچھ ناسخ ہوتے ہیں، یوں ہی بعض احادیث بظاہر آپس میں متضاد معلوم ہوتی ہیں؛ کسی حدیث میں ایک چیز کے جواز کا ثبوت ملتا ہے تو کسی دوسری حدیث سے اسی کے عدم جواز کا ثبوت ملتا ہے۔ مثلاً: نکاح متعہ (مقررہ مدت تک کے لیے نکاح کرنا) کے بارے میں مسلم شریف کی ایک حدیث ہے:

عن سلمة بن الأكوع وجابر بن عبد الله أن رسول الله ﷺ أتانا فأذن لنا في المتعة.[1]

حضرت سلمہ بن اکوع اور جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہمارے پاس تشریف لائے تو ہمیں متعہ کی اجازت دی۔

اور ایک دوسری حدیث میں ہے:

حدثنا عمرو الناقد و ابن نمير قالا نا سفيان بن عيينة عن الزهرى عن الربيع بن سبرة عن أبيه أن النبي ﷺ نهىٰ عن نكاح المتعة.[2]

(۱)- صحیح مسلم ج:۱ ص: ۴۵۱

(۲)-صحیح مسلم ج:۱ ص:۴۵۲

**ترجمہ:** ہم سے حدیث بیان کی عمرو ناقد اور ابن نمیر نے وہ فرماتے ہیں ہم سے حدیث بیان کی سفیان بن عیینہ نے وہ روایت کرتے ہیں زہری سے اور وہ ربیع بن سبرہ سے اور وہ اپنے والد سے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح متعہ سے منع فرمایا۔

اور ایک تیسری حدیث میں ہے:

عن ربيع بن سبرة الجهني أن أباه حدثه أنه كان مع رسول الله صلى الله تعالى عليه وسلم فقال: ياأيها الناس! إني كنت أذنت لكم في الاستمتاع من النساء وإن الله قد حرم ذلك إلىٰ يوم القيامة فمن كان عنده منهن شيء فليخل سبيلها ولا تأخذوا مما اٰتيتموهن شيئًا.[1]

حضرت ربیع بن سبرہ جہنی سے مروی ہے کہ ان کے والد نے ان سے حدیث بیان کی کہ وہ (یعنی سبرہ) نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے ساتھ تھے تو نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میں نے تمھیں عورتوں سے استمتاع (نکاح متعہ) کی اجازت دی تھی اور (اب) بے شک اللہ عزوجل نے اسے قیامت تک کے لیے حرام فرمادیا۔ توجس کے پاس نکاح متعہ کی عورتوں میں سے کوئی ہو اسے چھوڑ دے اور تم نے جو کچھ ان عورتوں کو (نکاح متعہ کے بدلے میں) دیا ہے ان میں سے کچھ نہ لو۔

اور چوتھی حدیث میں ہے:

عن أبي جريح قال قال عطاء قدم جابر بن عبد الله معتمرًا فجئناه في منزله فسأله القوم عن أشياء ثم ذكروا المتعة فقال: نعم استمتعنا علىٰ عهد رسول الله صلى الله تعالى عليه وسلم وأبي بكر و عمر.[2]

ابن جریج سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ حضرت عطا نے فرمایا کہ حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ عمرہ کے لیے آئے تو ہم ان کے پاس ان کی رہائش گاہ میں آئے تو لوگوں نے ان سے چند چیزوں کے بارے میں پوچھا پھر انھوں نے متعہ کا ذکر چھیڑا تو حضرت جابر بن عبد اللہ نے فرمایا: ہاں! ہم نے عہد رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور عہد ابوبکر و عمر میں نکاح متعہ کیا۔

(۱)- صحيح مسلم ج:۱ ص: ٤٥١

(۲)- صحيح مسلم: ج:۱ ص: ٤٥١

مذکورہ بالا حدیثوں میں سے پہلی دو حدیثیں آپس میں متضاد ہیں تو یقیناً ان میں ایک ناسخ اور دوسری منسوخ ہوگی۔ یوں ہی تیسری حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ عہد رسول ﷺ سے لے کر قیامت تک کے لیے متعہ حرام ہے اور چوتھی حدیث میں حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم نے عہد رسول ﷺ کے بعد ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کے زمانۂ خلافت میں بھی نکاح متعہ کیا۔

یونہی بعض حدیثیں بظاہر حکم قرآنی کے مخالف و مزاحم نظر آتی ہیں مثلاً: اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: وَ اُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِیْۤ اَرْضَعْنَكُمْ [1] یعنی اور تم پر تمھاری وہ مائیں حرام ہیں جنھوں نے تمھیں دودھ پلایا۔

اور حدیث پاک میں آیا ہے:

عن عائشة قالت: قال رسول الله ﷺ و قال سو يد (ابن سعيد) وزهير أن النبي ﷺ قال: لا تحرم المصة والمصتان. [2]

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا (اور حضرت سوید اور زہیر رضی اللہ عنہما سے بھی روایت ہے فرماتے ہیں کہ نبی پاک ﷺ نے ارشاد فرمایا) ایک دو دودھ کی چسکی (عورت کو دودھ پینے والے پر) حرام نہیں کرتی۔

اور ایک دوسری روایت میں ہے: عن النبي ﷺ قال: لا تحرم الإملاجة والإملاجتان [3] یعنی سرکار ﷺ نے ارشاد فرمایا: ایک دو بار دودھ پلانا حرام نہیں کرتا۔

لہٰذا یہ حدیثیں مذکورہ آیت کریمہ کے حکم مطلق کے بظاہر مخالف ہوئیں۔

مزید وضاحت کے لیے مندرجہ ذیل تفصیل ملاحظہ کریں:

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: وَ لَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ یُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَیْهِ [4] یعنی اس ذبیحے (ذبح کیا ہوا جانور) کو نہ کھاؤ جس پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو۔

---

(۱)- النساء: ۲۳

(۲)- صحيح مسلم ج: ۱، ص: ٤٥٢

(۳)- صحيح مسلم ج: ۱، ص: ٤٦٩

(۴)- الأنعام: ۱۲

اور علامہ ابن حجر عسقلانی ”بلوغ المرام“ میں ابوداؤد کے حوالے سے نقل فرماتے ہیں حضور ﷺ نے فرمایا: ذبیحة المسلم حلال ذکر اسم الله علیها أو لم یذکر. [1] یعنی مسلمان کا ذبیحہ حلال ہے خواہ بسم اللہ اللہ اکبر کہا ہو یا نہ کہا ہو۔ (قال ابن حجر العسقلانی: رجاله موثقون. یعنی علامہ ابن حجر عسقلانی نے فرمایا کہ اس کے تمام رواۃ ثقہ ہیں۔)

بہرحال حدیث پاک سے سمجھ میں آیا کہ ترک تسمیہ سے بھی جانور حلال ہی رہتا ہے۔ لہٰذا اس حدیث پر عمل کرنے سے حکم قرآن کو ترک کرنا لازم آئے گا اور اگر حکم قرآنی پر عمل کریں تو حکم حدیث کی خلاف ورزی ہوگی۔ اب اگر کوئی شخص یہ کہہ کر حدیث پر عمل کرے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ [2] (یعنی جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی) تو قرآن کے حکم صریح کی خلاف ورزی ہوتی ہے اور اگر حدیث ترک کردے تو اللہ کے اس حکم کی خلاف ورزی ہوتی ہے: وَمَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا [3] یعنی اللہ کے رسول ﷺ جو تمھیں دیں اسے لے لو اور جس چیز سے روکیں اس سے رک جاؤ۔ اب ایسی صورت میں عام آدمی کرے تو کیا کرے؟ ضرور اسے کچھ اصول و ضوابط کی پابندی کرنی پڑے گی اور علمائے کرام کی اطاعت کرنی ہوگی، اب اگر وہ شخص اپنی اکڑ میں یہ کہے کہ یہ اصول و ضوابط بعد کے علما نے گڑھ لیے ہیں ہم انھیں نہیں مانتے تو وہ خود بتائے وہ اس قرآن و حدیث کے اختلاف کے وقت کیا کرے گا؟

لہٰذا معلوم ہوا کہ حدیث کو کوئی بھی عام شخص بلا واسطہ نہیں سمجھ سکتا بلکہ اس کے لیے فن حدیث کی ضرورت پڑے گی۔ یوں ہی ایک علم کی وضاحت دوسرے علم سے اور دوسرے کی تیسرے سے ہوتی ہے اور اسی طرح سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اور ان تمام علوم کو حاصل کرنے کے بعد ہی قرآن و حدیث تک صحیح رسائی ہو سکتی ہے ورنہ ہرگز نہیں۔ اور یہ ظاہر سی بات ہے کہ اتنے علوم و فنون کو حاصل کرنا اور ان کے ذریعے قرآن و حدیث کو سمجھنا پھر ان

(۱)- أخرجه أبو داود في المراسيل.

(۲)- النساء: ۸۰

(۳)- الحشر: ۷

پر عمل کرنا نہایت ہی دشوار امر ہے بلکہ ہر ایک کے بس کی بات بھی نہیں۔ پھر عجمیوں کے لیے دین پر عمل کرنا ہی وبال جان ہوجائے گا کہ اس کلام معجز نظام کی حقیقت تک رسائی تو بآسانی عرب بھی نہیں پاتے۔ تقریب فہم کے لیے ایک روایت ذیل میں ملاحظہ کریں:

جب سحری کے متعلق آیت کریمہ: وَ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ [۱] (اور کھاؤ پیو یہاں تک کہ تمھارے لیے ظاہر ہوجائے سفید ڈورا سیاہ ڈورے سے پو پھٹ کر) نازل ہوئی تو صحابیِ رسول حضرت عدی بن حاتم طائی رضی اللہ عنہ دو ڈورے سفید اور کالے رنگ کے سرہانے لے کر سوگئے اور رات میں اٹھ اٹھ کر دیکھنے لگے کہ کب سفید ڈورا کالے ڈورے سے ممتاز ہوتا ہے جیسا کہ بخاری شریف میں ہے:

عن عدی بن حاتم قال: لما نزلت "حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ" عمدت إلیٰ عقال أسود و إلیٰ عقال أبیض فجعلتھما تحت وسادتي فجعلت أنظر في اللیل فلا یستبین لي، فغدوت علیٰ رسول الله صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فذکرت ذلك فقال إنما ذلك سواد اللیل و بیاض النھار. [۲]

یعنی حضرت عدی بن حاتم (طائی) رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں: جب آیت کریمہ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ نازل ہوئی تو میں نے کالا اور سفید ڈورا لیا اور انھیں اپنے تکیے کے نیچے رکھ لیا پھر رات میں دیکھنے لگا تو مجھ پر ظاہر نہ ہوئی، پس میں صبح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں گیا اور سارا معاملہ ان سے بیان کیا تو آپ نے فرمایا: بے شک وہ (یعنی سفید اور کالے ڈورے سے مراد) رات کی اندھیری اور دن کی سفیدی ہے۔

توجب قرآن کریم کا سمجھنا کسی صحابی کی فہم سے بالاتر ہوسکتا ہے تو ما و شما (ہم اور تم، عوام) کس گنتی میں؟ اب یہ بات بخوبی واضح ہوگئی کہ اگرچہ احکام شرعیہ پر عمل کرنا بہت آسان ہے مگر قرآن و حدیث کے مفاہیم و معانی کو سمجھ لینا اور ان سے مسائل و احکام کا استنباط و

(۱)- البقرۃ: ۱۸۷

(۲)- بخاری شریف ج: ۱، ص: ۲۵۷

استخراج انتہائی مشکل ہے بلکہ ہر ایک کے بس کی بات بھی نہیں کہ وہ قرآن و حدیث سے بلا واسطہ (Directly) مسائل کا استنباط و استخراج (deduction) کرے لہٰذا امت مسلمہ کی اس ضرورت کی تکمیل علمائے کرام خصوصاً ائمہ مجتہدین سے ہوئی۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے سروں پر "علماء أمتي كأنبياء بني إسرائيل" (یعنی میری امت کے علما بنی اسرائیل کے نبیوں کے مانند ہیں) اور "العلماء ورثة الأنبياء" (علما انبیائے کرام کے وارث ہیں) کا تاج زریں ہے۔ انھیں ائمۂ مجتہدین نے قرآن و حدیث کے مفاہیم و معانی کو مد نظر رکھتے ہوئے مسائل شرعیہ کا استنباط و استخراج کر کے علم فقہ کی تدوین کی اور بظاہر قرآن و حدیث کے ٹکراؤ سے پیدا ہونے والے خلجان (کنفیوژن) کا ازالہ فرما کر امت مسلمہ کے سامنے دین اسلام کی وضاحت (Clarity) کا عظیم تحفہ پیش کیا۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ علم فقہ ایک نعمت عظمیٰ اور دین کی وضاحت (Clarity) کا سبب ہے۔ اس علم فقہ کو "فتنۂ دہیما" اور "فکری کنفیوژن" کا نام دینا یا تو جہالت ہے یا حقیقت پر مکر و فریب کا پردہ ڈالنا۔

## مقدمہ ثانیہ

مقدمۂ اولیٰ سے اجتہاد و تقلید کی ضرورت و اہمیت کا بخوبی اندازہ ہو گیا ہوگا۔ اب تقلید کے وجوب کو بھی قرآن و حدیث اور اجماع امت سے ثابت کیا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم نازل فرمایا اور اس کے متعلق یوں ارشاد فرمایا: وَ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ[1] اور ہم نے تم پر کتاب اتاری جو ہر چیز کا بیان ہے۔

مگر ساتھ ہی یہ بھی ارشاد فرمایا: وَ مَا يَعْقِلُهَاۤ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ ﴿۴۳﴾[2] یعنی اس کی سمجھ نہیں مگر عالموں کو یعنی اس قرآن کو صرف علما ہی سمجھ سکتے ہیں اور رہی بات جہلا اور کم علموں کی تو انھیں یوں حکم فرمایا: فَسْـَٔلُوْۤا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۷﴾ یعنی اگر نہیں جانتے تو علم والوں سے پوچھ لو۔

اور ایسا بھی نہیں کہ علم والے بذات خود کتاب اللہ کو سمجھنے پر قادر ہیں بلکہ انھیں بھی اپنے سے بڑے علما یعنی ائمۂ مجتہدین سے پوچھنا ہے کیوں کہ قرآن مجید میں آیا ہے: وَ فَوْقَ

(۱)-النحل: ۸۹

(۲)-العنکبوت: ۴۳

كُلِّ ذِىۡ عِلۡمٍ عَلِيۡمٌ ﴿۷۶﴾[1] ہر علم والے سے بڑھ کر علم والا ہے۔ یعنی ایک عالم سے بڑھ کر دوسرا عالم ہوتا ہے۔ اور پھر ائمۂ مجتہدین کی گردنیں بھی کلام الٰہی کی توضیح وتشریح کرنے میں آزاد نہیں بلکہ وہ بھی احادیث رسول صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے محتاج ہیں۔ چناں چہ قرآن پاک میں ارشاد ہوا: وَ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَيۡكَ الذِّكۡرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيۡهِمۡ [2] یعنی اور اے نبی! ہم نے آپ کی جانب یہ قرآن اس لیے اتارا کہ آپ، لوگوں سے اس چیز کی تشریح فرمادیں جو ان کی طرف اتاری گئی۔

مذکورہ آیتوں کے اتصال (Attachment) سے یہ معلوم ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام (قرآن) کی فہم حاصل کرنے کا ترتیب وار سلسلہ اور ذریعہ بیان فرمادیا کہ: اے جاہلو! تم کلام علما کی طرف رجوع کرو اور اے علماے غیر مجتہدین تم ائمۂ مجتہدین کی طرف رجوع کرو! اور اے ائمۂ مجتہدین! تم میرے رسول محمد مصطفیٰ الذی لا ینطق عن الھویٰ إن ھو إلا وحي یوحی (یعنی وہ مصطفیٰ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم جو اپنی مرضی سے کوئی بات نہیں کرتے بلکہ وہ تو وحی الٰہی بیان کرتے ہیں) کے کلام حکمت نشان کی جانب رجوع کرو تو تمھیں ہمارا کلام معجز سمجھ میں آجائے گا۔ غرض اس طرح اللہ تعالیٰ نے ہم پر تقلید ائمہ (following of Aemmah) واجب فرمادی اور ائمہ کرام پر تقلید رسول صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم اور رسول پر تقلید قرآن۔

امام عارف باللہ عبد الوہاب شعرانی قدس سرہ الربانی نے اپنی کتاب "میزان الشریعۃ الکبریٰ" میں اس معنیٰ کو جابجا پوری تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ چناں چہ وہ رقم طراز ہیں: "لو لا أن رسول الله ﷺ فصل بشریعة ما أجمل في القرآن بقي علیٰ إجماله كما أن المجتهدين لو لم يفصلوا ما أجمل في السنة لبقيت علیٰ إجمالها وهٰكذا إلیٰ عصرنا هذا."

یعنی اگر رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم اپنی شریعت سے مجملات بیان نہ فرماتے تو قرآن یونہی مجمل رہ جاتا اور اگر ائمۂ مجتہدین مجملات حدیث کی تفصیل نہ کرتے تو حدیث بھی مجمل رہ جاتی اور اسی طرح ہمارے زمانے تک (یعنی بعد کے علما اگر کلام ائمہ کی تشریح نہ کرتے تو ہم اسے

(۱)-یوسف: ٧٦

(۲)-النحل: ٤٤

سمجھنے کی لیاقت نہ رکھتے۔

تو معلوم ہوا کہ یہ سلسلۂ ہدایت، رب قدیر جل جلالہ کا قائم کردہ ہے جو اسے توڑنا چاہے وہ ہدایت نہیں چاہتا بلکہ صریح ضلالت و گمرہی کی راہ چل رہا ہے۔ ایسے ہی لوگوں کے متعلق قرآن مقدس کا فرمان ہے: يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّ يَهْدِىْ بِهٖ كَثِيْرًا ؕ[1] یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ اسی قرآن سے بہتیروں کو گمراہ کرتا ہے اور بہتیروں کو سیدھی راہ عطا فرماتا ہے۔

تو جو لوگ اللہ تعالیٰ کے قائم کردہ سلسلے (یعنی سلسلۂ تقلید) پر چلتے ہیں بفضلہٖ تعالیٰ ہدایت پر ہوتے ہیں اور جو اس سلسلے کو توڑ کر اپنی ناقص اور اوندھی سمجھ کے بھروسے قرآن وحدیث سے بذات خود مطلب نکالنا چاہتے ہیں گمرہی کے جنگل میں بھٹک جاتے ہیں۔ حدیث پاک میں آیا ہے:

عن جندب بن عبد الله قال قال رسول الله ﷺ من قال في القرآن برأيه فأصاب فقد أخطأ.[2]

حضرت جندب بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس نے قرآن میں اپنی رائے سے کچھ کہا اگرچہ صحیح کہا پھر بھی اس نے غلطی کی۔

امیر المؤمنین عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

سيأتي ناس يجادلونكم بشبهات القرآن فخذهم بالسنن فإن أصحاب السنن أعلم بكتاب الله. (رواه الدارمي ونصر المقدسي في الحجة واللالكائي في "السنة" وابن عبد البر في "العلم" وابن ابي زمين في "أصل السنة" والدارقطني والأصبهاني في "الحجة" و ابن نجار.)

یعنی قریب ہے کہ کچھ لوگ ایسے آئیں گے جو تم سے قرآن عظیم کے کلمات متشابہات سے جھگڑیں گے تو تم حدیثوں سے ان کی گرفت کرنا کیوں کہ صاحبان حدیث (محدثین) قرآن کو خوب جانتے ہیں۔

اب آئیے اصحاب سنن (محدثین) کیا فرماتے ہیں اسے ملاحظہ کریں:

(۱)- البقرۃ: ۲۶

(۲)- سنن الترمذی ج:۲، ص:۱۱۹

❁جلیل القدر محدث راوی صحاح ستہ امام سفیان بن عیینہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: "الحدیث مضلة إلا الفقهاء." یعنی حدیث گمراہ کردینے والی ہے (جیساکہ قرآن سے بھی لوگ گمراہ ہوجاتے ہیں جس کا بیان گزرچکا یونہی حدیث سے بھی گمراہ ہوجاتے ہیں) سوائے فقہا کے یعنی فقہائے کرام گمراہ نہیں ہوتے۔

❁مشہور محدث تابعی امام اعمش امام اعظم کی تعریف میں فرماتے ہیں: "یا معشر الفقهاء أنتم الأطباء ونحن الصیادلة وأنت أیها الرجل أخذت بکلا الطرفین." اے گروہ فقہا! تم طبیب ہو اور ہم محدثین عطار (دوافروش، میڈیکل اسٹور والے) ہیں اور اے شخص (ابوحنیفہ) تم نے فقہ و حدیث دونوں حاصل کرلیا۔

واقعہ یوں پیش آیا کہ کسی نے امام اعمش سے چند مسائل دریافت کیے۔ وہ جواب نہ دے سکے تو انھوں نے اپنے شاگرد امام اعظم ابوحنیفہ سے پوچھا۔ امام اعظم نے ان مسائل کا شرعی حکم بیان فرمادیا۔ امام اعمش نے فرمایا: یہ آپ کہاں سے کہہ رہے ہیں؟ ابوحنیفہ نے کہا: آپ ہی کی بیان کردہ احادیث سے، پھر امام نے ان احادیث کو مع سند کے سنادیا جن سے ان مسائل کا حل نکلتا تھا۔ اس پر امام اعمش نے کہا: بس بس میں نے جتنی حدیثیں آپ سے سو دن میں بیان کی تھیں آپ نے سب ایک ہی دن میں سنادیں۔ میں نہیں جانتا تھا کہ آپ احادیث میں یہ عمل (یعنی استنباط واستخراج) کرتے ہیں۔ پھر امام اعمش نے وہ جملہ کہا جو اوپر مذکور ہے۔

تو اگر فقہائے کرام اور ائمۂ مجتہدین "فتنۂ دہیما" یعنی سیاہ فتنہ اور "فکری کنفیوژن" کے شکار ہوتے اور قرآن و حدیث کے معانی و مفاہیم کو توڑ مروڑ کر بیان کرتے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قول (جس کا ذکر اوپر ہوا) کے مطابق اصحاب سنن (محدثین کرام) ان فقہا کی گرفت فرماتے نہ کہ ان کے شاگرد و مقلد اور ان کے مقام رفیع کے معترف ہوجاتے۔

چناں چہ امام بخاری کی ۲۲/ ثلاثیات (۱) میں سے ۲۱/ کے راوی امام اعظم ابوحنیفہ کے شاگرد ہیں۔ اس طرح خود امام بخاری امام اعظم کے پوتے شاگرد اور امام اعظم، امام بخاری کے دادا استاذ ہوئے۔ اسی طرح اگر دیکھا جائے تو امام مسلم، امام ترمذی، امام نسائی اور دیگر محدثین جو

(۱)- یعنی وہ حدیثیں جن کی سند تین واسطوں میں سرکار دوجہاں علیہ التحیۃ والثناء تک پہنچتی ہیں اور یہی

کہ امام بخاری کے شاگرد ہیں سب کے سب امام اعظم کے پوتے یا پڑپوتے شاگرد ہیں اور امام اعظم ان سب کے "شیخ الشیوخ فی الحدیث والفقہ" ہیں۔

یونہی امام بخاری مذہب حنبلی کے امام "احمد بن حنبل" کے شاگرد ہیں، آٹھ مرتبہ ان کے پاس بغداد گئے اور ان سے براہ راست حدیث کی سماعت کی۔[1]

امام احمد بن حنبل، امام شافعی کے شاگرد ہیں اور امام شافعی امام مالک کے شاگرد ہیں، اس سلسلۂ تلمذ کے اعتبار سے امام بخاری اور امام بخاری کے تلامذہ یعنی امام مسلم، امام ترمذی، امام نسائی اور دیگر محدثین سب فقہ کے ائمہ اربعہ (ابوحنیفہ، مالک، شافعی، احمد بن حنبل) کے شاگرد اور فیض یافتہ ہیں۔

## محدثین کے نزدیک ائمہ مجتہدین کا مقام و مرتبہ

گزر چکا کہ امام بخاری کے ۲۲/ ثلاثیات میں سے ۲۱/ کے راوی امام اعظم کے شاگرد ہیں۔ اس سے بھی امام اعظم کے بلند مقام کا پتہ چلتا ہے مزید ان کے نزدیک اپنے شیخ امام اعظم کی کیا قدر و منزلت تھی اس کی چند مثالیں ذیل میں ملاحظہ کریں:

امام مکی بن ابراہیم (متوفی ۲۱۵ھ) جو مشہور حافظ حدیث[2] ہیں اور امام بخاری کی ۲۲/ ثلاثیات میں سے ۱۱/ کے راوی ہیں علاوہ ازیں صحاح ستہ میں سے سنن نسائی کے علاوہ باقی پانچ کتب صحاح (صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ترمذی، سنن ابی داؤد اور سنن ابن ماجہ) کے بھی سلسلۂ رواۃ میں سے ہیں ان کی امام اعظم سے عقیدت کا اندازہ لگائیں:

اسماعیل بن بشر کہتے ہیں کہ ہم مکی بن ابراہیم کی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے تو آپ نے درس دیتے ہوئے کہا: "حدثنا أبو حنيفة" (ہم سے حدیث بیان کی ابوحنیفہ نے) اتنے میں ایک اجنبی شخص نے چیخ کر کہا: آپ ہم سے ابن جریج کی حدیث بیان کیجیے اور ابوحنیفہ کی حدیث

---

(بقیہ حاشیہ) وہ اسانید عالیہ ہیں جن پر امام بخاری کو فخر اور جن کی بدولت صحیح بخاری شریف کو دیگر تمام کتب صحاح پر فوقیت حاصل ہے۔

(۱)- تاریخ بغداد ج:۲، ص:۲۲

(۲)- حافظ حدیث اس شخص کو کہتے ہیں جسے کم از کم ایک لاکھ احادیث سند و متن کے ساتھ زبانی یاد ہوں ساتھ ہی ان احادیث کے رُواۃ کے احوال بھی جرحاً و تعدیلاً معلوم ہوں۔

مت بیان کیجیے۔ امام مکی نے فرمایا: إنا لا نحدث السفهاء، حرمت عليك أن تكتب عني، قم من مجلسي، فلم يحدث حتیٰ أقيم الرجل من مجلسه، ثم قال: حدثنا أبو حنيفة و مر فيه.[1] یعنی ہم بے وقوفوں سے حدیث بیان نہیں کرتے، میں تجھ پر مجھ سے حدیث لکھنا حرام کرتا ہوں، میری مجلس سے اٹھ جا۔ تو آپ نے اس شخص کے مجلس سے اٹھائے جانے تک حدیث بیان نہ کی (پھر جب وہ چلا گیا تو) آپ نے فرمایا: ہم سے حدیث بیان کی ابو حنیفہ نے اور مسلسل بیان کرتے رہے۔

ثلاثیات بخاری میں چھ ثلاثیات کے راوی "امام ابو عاصم ابو ضحاک بن مخلد شیبانی النبیل" (وفات ۲۱۲ھ) ہیں جو حافظ حدیث بھی ہیں اور تمام کتب صحاح ستہ کے راوی بھی۔ ان کے متعلق ضرار بن صرد فرماتے ہیں:

سألت أبا عاصم النبيل فقلت: أيما أفقه، سفيان أو أبو حنيفة؟ قال: غلام من غلمان أبي حنيفة أفقه من سفيان.[2]

میں نے ابو عاصم نبیل سے پوچھا: بڑے فقیہ کون ہیں سفیان ثوری (جو امیر المؤمنین فی الحدیث ہیں) یا ابو حنیفہ؟ انھوں نے فرمایا: ابو حنیفہ کے شاگردوں میں سے ایک عام شاگرد بھی سفیان ثوری سے بڑا فقیہ ہے۔

مذکورہ بالا بیان سے جہاں امام اعظم ابو حنیفہ کی فقاہت کی بلندی کا پتہ چلتا ہے وہیں یہ بھی سمجھ میں آتا ہے کہ ان محدثین کے نزدیک علم فقہ کی کتنی اہمیت و وقعت تھی۔

امام احمد بن حنبل کے مقام رفیع کا پتہ امام بخاری کے اس قول سے چلتا ہے۔ امام بخاری فرماتے ہیں:

دخلت بغداد آخر ثمان مرات، كل ذلك أجالس أحمد بن حنبل[3]

یعنی میں آخری آٹھ بار بغداد گیا، ہر بار میں نے امام احمد بن حنبل کی مجالست اختیار کی (یعنی ان کی بارگاہ میں بیٹھ کر ان سے حدیث پڑھی)

(۱)- مناقب الإمام الأعظم للموفق

(۲)- تاریخ بغداد ج:۱۳، ص:۳۴۲

(۳)- تاریخ بغداد ج:۲، ص:۲۲

اور امام شافعی کا مقام محدثین کے نزدیک دیکھیں کہ امام ابویعلی خلیل بن عبد اللہ خلیلی (وفات ۴۴۶ھ) اپنی کتاب "الإرشاد في معرفة علماء الحديث" میں اور امام ابن حجر عسقلانی نے "تهذيب التهذيب (في ترجمة الإمام الشافعي)" میں امام احمد بن حنبل کی ایک روایت نقل کی ہے۔ امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں:

سمعت المؤطا من بضعة عشر نفسًا من حفاظ أصحاب مالك فأعدته على الشافعي لأني وجدتهم أقومهم به.

میں نے مؤطا کا امام مالک کے دس سے زائد حفاظ احادیث سے سماع کیا اور پھر ان کے بعد امام شافعی سے سماع کیا کیوں کہ میں نے انھیں باقی محدثین سے زیادہ پختہ پایا۔

امام احمد بن حنبل سے کچھ مختلف الفاظ میں حافظ حدیث امام ذہبی نے "سير أعلام النبلاء" میں اور حافظ ابن حجر عسقلانی نے "النكت علىٰ كتاب ابن الصلاح" میں اور امام جلال الدین سیوطی نے "تدريب الراوي" میں یہی تاثر پیش کیا۔

درج بالا محدثین کے تاثرات سے جہاں امام شافعی کی حدیث میں مہارت کا پتہ چلتا ہے وہیں امام مالک کی کتاب "مؤطا" اور خود امام مالک کے بلند مقام کا بھی علم ہوتا ہے۔ امام سبکی نے "طبقات الشافعية الكبرىٰ" میں لکھا ہے کہ امام مالک کی سند "مالك عن نافع عن ابن عمر" کو (محدثین کے نزدیک) "سلسلة الذهب" (یعنی سونے کی زنجیر) کہا جاتا ہے۔ اس سے بھی امام مالک کی توثیق میں اضافہ ہوتا ہے۔

## تقلید ائمہ پر اجماع امت

ائمۂ مجتہدین کی تقلید پر امت مسلمہ کے عوام و خواص، علما و مشائخ، محدثین و مفسرین، اولیاے کرام اور صالحین- خواہ غوث اعظم جیلانی ہوں یا امام غزالی یا امام مسلم ہوں یا امام بخاری- سب نے اجماع کیا ہے اور خود مقلد بن کر امت مسلمہ کو یہ پیغام دیا ہے کہ مسلمانو! تم صبح و شام نمازوں میں " اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ ۙ۝۵ صِرَاطَ الَّذِيۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ ۙ۬ " کے ذریعے جن کی راہ میں گام زن رہنے کی دعائیں کرتے ہو وہ صالحین بھی تقلید کی رسی کو مضبوطی سے تھام کر ہی راہ سلوک و صفا طے کرتے ہیں۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی لکھتے ہیں:

إنّ هذه المذاهب الأربعة المدونة المحررة قد اجتمعت الأئمة أو من يعتد منها على جواز تقليدها إلى يومنا هذا. وفي ذلك من المصالح مالا يخفى لا سيما في هذه الأيام التي قصرت فيه الهمم جدا فأشربت النفوس الهوى وأعجب كل ذي رائ برأيه.[1]

**ترجمہ:** یہ چاروں مذاہب (حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی) جو مدوّن اور مرتب ہیں ان کی تقلید پر آج تک کی امت مسلمہ خصوصًا امت کے معتبر افراد کا اتفاق و اجماع چلا آرہا ہے۔ اور اس تقلید میں جو مصلحتیں ہیں وہ پوشیدہ نہیں خاص کر اس زمانے میں جب کہ لوگوں کی فکریں بہت کوتاہ ہوچکیں ہیں اور خواہش نفس لوگوں کے قلوب میں جاگزیں ہوچکی ہیں اور ہر شخص اپنی ہی رائے کو اچھا سمجھنے لگا ہے۔ (یعنی اس دور میں تقلید کا وجوب اور زیادہ مؤکد ہوجاتا ہے۔)

## محدثین کرام اور تقلید:

تقلید کا سلسلہ اسلام کے ابتدائی ادوار ہی سے چلا آرہا ہے۔ محدثین میں سے بعض کو اگرچہ کسی مجتہد کے اجتہاد سے فروعی اختلاف رہا لیکن پھر بھی کسی محدث نے اپنی گردن کو تقلید سے آزاد نہیں رکھا۔ چناں چہ امام بخاری، امام مسلم، ابوداؤد اور امام ترمذی وغیرہ مؤلفین صحاح امام شافعی کے مقلد ہیں۔

## مسالک اربعہ کے مشہور حفاظ احادیث

**احناف کے مشہور حفاظ احادیث:** حفاظ احادیث میں سے ① امام حافظ اسحاق بن راہویہ ② امام عبد الباقی ③ امام حافظ ابوبکر رازی ④ امام حافظ شمس الدین ⑤ حافظ قلب الدین حلبی ⑥ حافظ علاء الدین مارویني ⑦ بدر الدین عینی وغیرہ حنفی ہیں۔ (علیہم الرحمۃ والرضوان)

**شوافع کے مشہور حفاظ احادیث:** ① امام حافظ دارقطنی ② امام بیہقی ③ حافظ ابن الدقیق ④ امام ذہبی ⑤ حافظ ابن اثیر جزری ⑥ حافظ ابن حجر ہیثمی ⑦ حافظ ابن حجر عسقلانی وغیرہ شافعی ہیں۔ (علیہم الرحمۃ والرضوان)

**مالکیہ کے مشہور حفاظ احادیث:** ① امام زحیلی ② حافظ ابن عبد البر ③ حافظ قاضی عیاض ④ ابوبکر العربي ⑤ حافظ ابن ارشد وغیرہ مالکی ہیں۔ (علیہم الرحمۃ والرضوان)

(۱)- حجۃ اللہ البالغۃ ج:۱، ص:۱۵۴

**حنابلہ کے مشہور حفاظ احادیث:** ① امام عبد الغنی المقدسی ② حافظ ابو الفرج بن الجوزی ③ حافظ ابن قدامہ وغیرہ حنبلی ہیں۔ (علیہم الرحمۃ والرضوان)

اولیاے کرام میں سیدنا غوث اعظم جیلانی (رحمۃ اللہ علیہ) امام احمد بن حنبل کے مقلد، امام غزالی امام شافعی کے مقلد اور خواجہ غریب نواز چشتی اور خواجہ باقی باللہ نقشبندی اور مجدد الف ثانی احمد سرہندی نقشبندی وغیرہ امام اعظم ابو حنیفہ کے مقلد ہیں۔ (علیہم الرحمۃ والرضوان)

اس طرح دیکھا جائے تو امت کے اسلاف و اخلاف سب کے سب مقلد ہی نظر آئیں گے سوائے ان ناسمجھوں کے جنھوں نے پچھلی دو تین صدیوں سے ابن عبد الوہاب جیسوں کی اتباع و تقلید میں ائمۂ اربعہ کی تقلید سے روگردانی کی۔ یہی لوگ اہل حدیث، سلفی، وہابی و نجدی اور غیر مقلد کہلاتے ہیں۔

سرکار دوجہاں ﷺ نے ارشاد فرمایا: لا یجتمع أمتی علی الضلالة و ید الله علی الجماعة فإن من شذ شذ في النار.

یعنی میری امت گمراہی پر کبھی متفق نہیں ہوگی۔ اللہ کی تائید جماعت کے ساتھ ہے جو شخص جماعت سے کٹا (الگ ہوا، جدا ہوا) وہ کٹ کے جہنم میں گیا۔

اسی طرح کی حدیث سنن نسائی میں بھی ہے اور جامع ترمذی میں بھی۔ ترمذی کے الفاظ کچھ اس طرح کے ہیں: إن الله لا یجمع أمتی (أو قال: أمة محمد) علی الضلالة و ید الله علی الجماعة و من شذ شذ إلی النار.[1]

یعنی بے شک اللہ تعالیٰ میری امت کو (یا یہ فرمایا کہ امت محمد ﷺ کو) گمرہی پر جمع نہیں فرمائے گا، اور اللہ کی حمایت جماعت کے ساتھ ہے اور جو جماعت سے الگ ہوا جہنم میں جا گرا۔

لیکن غیر مقلدوں نے تقلید کو گمرہی قرار دے کر دوسری صدی سے لے کر اب تک کے سارے مسلمانوں کو (جنھوں نے تقلید ائمہ پر اجماع کیا ہے) گمراہ اور گمراہ گر قرار دے دیا حالاں کہ یہ خود جماعت مسلمین سے کٹ گئے اور حدیث کے مطابق جہنم میں جا

(۱)-جامع الترمذي ج: ۲، ص: ۳۹ باب لزوم الجماعة.

گرے۔ ان غیر مقلدوں نے عام مسلمین کی راہ سے ہٹ کر ایک نئی راہ عدم تقلید کی نکالی اور ایک الگ فرقہ بنالیا۔ ایسے ہی لوگ اللہ تعالیٰ اور رسول ﷺ کے مندرجہ ذیل اقوال کے مستحق ہیں:

(۱)۔ وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَ يَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَ نُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ؕ وَ سَآءَتْ مَصِيْرًا ﴿۱۱۵﴾ [۱]

**ترجمہ:** اور جو رسول کا خلاف کرے بعد اس کے کہ حق اس پر کھل چکا اور مسلمانوں کی راہ سے جدا راستے پر چلے تو ہم اسے اس کے حال پر چھوڑ دیں گے اور اسے دوزخ میں داخل کریں گے جو بری جگہ ہے پلٹنے کی۔

مذکورہ بالا آیتِ کریمہ سے اجماعِ مسلمین کی حجیت ثابت ہوتی ہے کہ طریقِ مسلمین ہی صراطِ مستقیم ہے۔ اور (یہ بھی معلوم ہوا کہ جو سزا حضور ﷺ کی مخالفت کرنے والے کفار کی ہے وہی سزا ان کلمہ گو بے دینوں کی بھی ہے جو عام مسلمانوں کی راہ سے ہٹ کر راہ قائم کریں) مسلمانوں نے قرونِ اولیٰ (قرون مشہود لھا بالخیر) سے لے کر اب تک تقلید کو اپنی راہ قرار دیا لیکن غیر مقلدوں نے تقلید کی مخالفت کر کے دوسری راہ اختیار کر لی۔

(۲)۔ حدیثِ پاک میں ہے: اتبعوا السواد الأعظم فإنه من شذ شذ فی النار. [۲]

**ترجمہ:** بڑے گروہ کی پیروی کرو کیوں کہ جو مسلمانوں کی جماعت سے الگ ہوا وہ کٹ کے جہنم میں گیا۔ مسلمانوں کی بڑی جماعت مقلد ہے، نوپید غیر مقلدین اپنا انجام سوچ لیں۔

(۳)۔ امام ترمذی اور امام احمد بن حنبل نے حارث اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت کی: قال رسول اللہ ﷺ أمرکم بخمس بالجماعة والسمع والطاعة و الهجرة و الجهاد فی سبیل الله وأنه من خرج من الجماعة قید شبر فقد خلع ربقة الإسلام من عنقه. الخ [۳]

**ترجمہ:** حضور ﷺ نے فرمایا تمھیں پانچ چیزوں کا حکم دیتا ہوں (۱) جماعت (۲) سماعت

(۱)۔ النساء: ۱۱۵

(۲)۔ مشکوٰۃ شریف، یہ حدیث ترمذی کتاب الفتن باب لزوم الجماعۃ میں بھی ہے لیکن الفاظ کچھ مختلف ہیں۔

(۳) مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الامارۃ والقضاء، ص: ۳۲۱

(۳)اطاعت (۴)ہجرت اور (۵) جہاد فی سبیل اللہ۔اور جو شخص جماعت سے ایک بالشت برابر نکلا اس نے اسلام کا پٹا اپنی گردن سے اتار دیا۔

عام مسلمانوں کی جماعت سے غیر مقلدین تیرہویں صدی میں نکل گئے وہ اپنا انجام سوچیں۔

(۴)-امام احمد نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت کی:

قال رسول الله ﷺ إن الشيطان ذئب الإنسان كذئب الغنم يأخذ الشاذة و القاصية و الناحية و إياكم و الشعاب و عليكم بالجماعة و العامة.[1]

**ترجمہ:** رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: بے شک شیطان انسان کا بھیڑیا ہے۔ جیسے بھیڑیا (ریوڑ سے) الگ رہنے والی یا کنارے والی یا بچھڑنے والی بکری کا شکار کرتا ہے ایسے ہی شیطان جماعت مسلمین سے الگ رہنے والے کا شکار کرتا ہے۔تم گھاٹیوں سے بچو عامۃ المسلمین کے ساتھ رہو۔

(۵)- حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے ترمذی شریف میں ایک لمبی حدیث مروی ہے، اس کا ایک حصہ یہ ہے:

"عليكم بالجماعة و إياكم و الفرقة فإن الشيطان مع الواحد"[2]

ترجمہ: تم پر جماعت کی پیروی لازم ہے اور فرقہ بندی سے بچو کیوں کہ شیطان تنہا (شخص) کے ساتھ ہے۔

لیکن غیر مقلدوں نے عامۃ المسلمین کی جماعت کو ترک کر دیا اور محمد بن عبد الوہاب نجدی کی قیادت میں ایک فرقہ بنالیا۔اس زمانے میں اس فرقے کو غیر مقلد، سلفی اور وہابی کہا جاتا ہے۔

محمد شہباز انور برکاتی

اتر دیناج پور (بنگال)

متعلم: الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور، اعظم گڑھ (یوپی)

(۱)- مشکوۃ المصابیح، باب الاعتصام بالکتاب و السنۃ، الفصل الثالث، ص: ۳۱

(۲)- ترمذی کتاب الفتن، باب لزوم الجماعۃ، ج:۲/ ص:۳۹/ مطبوعہ مجلس برکات الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور۔

# فتنۂ دہیما کی حقیقت

قارئین! اب جب کہ علم فقہ اور امام اعظم امام الفقہا و المحدثین اور دیگر ائمۂ فقہ وحدیث کی مختصر معرفت حاصل ہوگئی اور قرون اولیٰ سے اب تک کے خوش عقیدہ مسلمانوں کا طریقہ معلوم ہوگیا تو اب آئیے **مولانا وحید الدین خاں صدر اسلامی مرکز دہلی** کے ماہنامہ **"الرسالہ"** کی زہر افشانیوں کو بھی ملاحظہ فرمائیں۔

"الرسالہ" پچھلے بیس پچیس سالوں سے دہلی سے نکلتا ہے۔ اس کے تمام مضامین خود ایڈیٹر مولانا وحید الدین خاں کے ہوتے ہیں، دوسرے کا مضمون شاید ہی کبھی شائع ہوتا ہو۔ اس رسالے میں وقتاً فوقتاً معمولات اہل سنت کے خلاف تحریریں آتی رہتی ہیں جس کا اندازہ آپ کو ہماری اس تحریر سے بخوبی ہوجائے گا۔ الرسالہ انٹرنیٹ پر بھی دستیاب ہے۔ اگر زیر نظر تحریر میں آپ کو کہیں شبہ ہو تو انٹرنیٹ پر بھی دیکھ سکتے ہیں۔

مولانا وحید الدین خان نے "الرسالہ" ماہ اگست ۲۰۱۵ء میں جہاں "پیغمبر کی حیثیت" کے نام سے ایک مضمون لکھ کر امت مسلمہ کے دلوں سے محبوب خدا علیہ التحیۃ والثنا کی محبتوں کے چراغ کو گل کرنے کی کوشش کی ہے (اس تعلق سے کچھ باتیں اس تحریر کے آخر میں آئیں گی۔ ان شاء اللہ) وہیں **"فتنۂ دھیماء: فکری کنفیوژن"** کے نام سے ایک طویل مضمون لکھ کر تقلید تو تقلید سرے سے علم فقہ ہی کو فتنۂ دھیما اور فکری کنفیوژن کا نام دے دیا اور اس طرح لوگوں کو بے راہ روی کی دعوت دی۔ آئیے اب "فتنۂ دھیما: فکری کنفیوژن" کا تحقیقی اور شرعی تجزیہ وتحلیل کریں۔

مولانا وحید الدین خاں اپنے مضمون کا آغاز کچھ اس طرح کرتے ہیں:

"پیغمبر اسلام ﷺ کی ایک حدیث دور فتنہ کے بارے میں آئی ہے۔ یہ ایک لمبی حدیث ہے۔ اس کا ایک حصہ یہ ہے: "ثم فتنة الدُّهيماء لا تدع أحدا من هٰذه الأمة إلا لطمته لطمة" (سنن ابی داؤد حدیث: ۴۲۴۲) یعنی آخری زمانے میں فتنۂ دھیما ظاہر ہوگا، وہ اتنا زیادہ عام ہوگا کہ امت کا کوئی بھی شخص نہیں بچے گا جو اس فتنے کی زد میں نہ آجائے۔

It will hit everyone without any exception

اس حدیث رسول میں دہیما کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ دہیما کے لیے مشہور عربی لغت "لسان العرب" میں یہ الفاظ آئے ہیں "الفتنة السوداء المظلمة" (۱۲/۲۱۱) دھیما کی تصغیر مبالغے کے لیے ہے یعنی فتنۂ دہیما بہت زیادہ سیاہ اور سخت تاریکی پیدا کرنے والا ہوگا۔ اس حدیث رسول کے مطابق فتنۂ دہیما کا زمانہ مکمل تاریکی کا زمانہ (age of total darkness) ہوگا۔ تاریکی سے مراد فکری تاریکی (intellectual darkness) ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب ہے مکمل فکری کنفیوژن (utter intellectual)"

پھر آگے دس صفحات کے بعد صفحہ ۲۲ر میں اس فتنے کا زمانہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"حقیقت یہ ہے کہ وہ چیز جس کو حدیث میں فتنۂ دہیما کہا گیا ہے اس کا زمانہ خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کے بعد ہی شروع ہوگیا تھا۔ اس کے بعد وہ بڑھتا رہا یہاں تک کہ بیسویں صدی میں وہ اپنی کامل صورت میں پوری امت مسلمہ کے درمیان چھا گیا۔"

پھر صفحہ ۱۹ پر اس فتنے کی تشریح کچھ اس طرح کرتے ہیں:

"مذکورہ حدیث رسول میں جس فتنۂ دہیما کا ذکر ہے وہ اصلاً یہی فتنہ ہے یعنی قرآنی طرز فکر کا خاتمہ اور فقہی طرز فکر کی عمومی اشاعت اور پھر دور پریس میں اس کا اتنا زیادہ بڑھ جانا کہ کوئی بھی مسلمان اس کی زد سے محفوظ نہ رہے۔"

مولانا (وحید الدین خاں) موصوف نے سردست "سنن ابی داؤد" کی ایک لمبی حدیث کے درمیان سے ایک جملہ نقل کیا اور اس کے ماقبل ومابعد کی پوری حدیث چھوڑ دی۔ اور اس جملے میں مذکور فتنے کا زمانہ متعیّن کرتے ہوئے لکھا کہ " اس کا زمانہ خلیفہ عمر بن عبد العزیز کے بعد ہی سے شرع ہوگیا تھا" پھر اس فتنے کی تعیین کرتے ہوئے "علم فقہ" کو فتنۂ دہیما یعنی سیاہ فتنہ قرار دیا۔ تو اب آئیے مکمل حدیث پاک کو پڑھ کر اسی حدیث رسول ﷺ کے مطابق مولانا موصوف کے زمانے کو متعیّن کرنے اور علم فقہ کو فتنۂ دہیما قرار دینے کی

**صحت وعدم صحت کا فیصلہ خود کیجیے:**

حدثنا يحيىٰ بن عثمان بن سعيد الحمصي نا أبو المغيرة قال: حدثني عبد الله بن سالم قال: حدثني العلاء بن عتبة عن عمير بن هاني العنسي قال: سمعت عبد الله بن عمر يقول: كنا قعودا عند رسول الله ﷺ فذكر الفتن فأكثر في ذكرها حتىٰ ذكر فتنة الأحلاس فقال قائل يا رسول الله: وما فتنة الأحلاس؟ قال: هرب و حرب. ثمّ فتنة السراء دخنها من تحت قدمي رجل من أهل بيتي يزعم أنه مني وليس مني وإنما أوليائي المتقون، ثم يصطلح الناس علىٰ رجل كورك علىٰ ضلع ثم فتنة الدهيماء لا تدع أحدًا من هٰذه الأمة إلا لطمته لطمة فإذا قيل: انقضت تمادت يصبح الرجل فيها مؤمنا و يمسى كافرا حتىٰ يصير الناس إلىٰ فسطاطين فسطاط إيمان لا نفاق فيه و فسطاط نفاق لا إيمان فيه، فإذا كان ذاكم فانتظروا الدجال من يومه أو من غده.(۱)

**ترجمہ:** ہم سے حدیث بیان کی یحیی ابن عثمان بن سعید حمصی نے وہ کہتے ہیں ہم سے ابو مغیرہ نے، وہ کہتے ہیں مجھ سے عبد اللہ بن سالم نے اور وہ کہتے ہیں مجھ سے علا بن عتبہ نے حدیث بیان کی اور وہ (علا بن عتبہ) روایت کرتے ہیں عمیر بن ہانی عنسی سے کہ عمیر کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو فرماتے ہوئے سنا کہ ہم (صحابہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں بیٹھے تھے کہ آپ نے فتنوں کا ذکر فرمایا، پھر کثرت سے ان کا ذکر کرتے ہوئے ”فتنۂ احلاس“ کا ذکر کیا۔ تو کسی کہنے والے نے کہا: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم فتنۂ احلاس کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: بھاگنا اور قتل وقتال ہے۔ (اس کے بعد فرمایا) پھر ”فتنۂ سراء“ ہے جو ایسے شخص کے قدموں کے نیچے سے نکلے گا جو گمان کرے گا کہ وہ میرے اہل بیت سے ہے حالاں کہ وہ مجھ سے (یعنی میرا) نہ ہوگا، بے شک میرے دوست تو متقی لوگ ہی ہیں۔ پھر (ارشاد فرمایا) لوگ ایسے شخص پر اتفاق کریں گے جو پسلی پر سرین کی مانند ہوگا۔ (یعنی بے نظم ونسق آدمی ہوگا) پھر ”فتنۂ دہیما“ بپا ہوگا جو اس امت کے ہر فرد کو لپیٹ میں لے لے گا تو جب کہا جائے کہ فتنہ ختم ہوگیا (تو وہ اور) بھڑک اٹھے گا۔ اس فتنے کے زمانے میں آدمی صبح کے وقت مومن

(۱)- سنن أبي داؤد: كتاب الفتن، ص: ۵۸۲ مطبوعہ اشرفی بکڈپو۔

رہے گا اور شام کے وقت (وہی آدمی) کافر ہو جائے گا یہاں تک کہ لوگ دو جماعتوں میں بٹ جائیں گے؛ ایک ایمان کا گروہ ہوگا جس میں صرف ایمان ہی ایمان ہوگا کچھ بھی نفاق نہ ہوگا اور دوسرا گروہ نفاق کا ہوگا جس میں صرف نفاق ہی ہوگا کچھ بھی ایمان نہ ہوگا۔ تو جب تم اس چیز کو ہوتے ہوئے دیکھ لو تو اسی دن دجال کا انتظار کر و یا اس کے بعد والے دن۔

پوری حدیث پڑھنے کے بعد آپ نے جان لیا ہوگا کہ سرکار دوجہاں ﷺ نے پہلے "فتنۂ احلاس" پھر "فتنۂ سراء" اور اس کے بعد "فتنۂ دہیما" کا ذکر فرمایا (اس سے بھی فتنۂ دہیما کے بُعد یعنی دوری کا پتہ چلتا ہے) اور یہ فتنہ اس قدر خطرناک ہوگا کہ صبح کو مسلمان رہنے والا اس کی زد سے شام تک کافر ہو جائے نیز سرکار دوعالم ﷺ کے فرمان سے یہ بھی سمجھ میں آیا کہ اوّلاً یہ فتنہ امت کے ہر فرد کو ایک جھٹکا دے گا مگر پھر بتائید خداوندی مسلمان اس فتنے کے چنگل سے اس طرح آزاد ہو جائیں گے کہ ان میں صرف ایمان ہی ایمان ہوگا اور نفاق کا شائبہ تک نہ ہوگا۔ اور وہ لوگ جن کی تقدیر میں کفر لکھا ہے وہی اس فتنے میں رہ جائیں گے اور ان کے اندر صرف نفاق ہی ہوگا اور ایمان کا کوئی حصہ بھی ان میں موجود نہ ہوگا اور یہ سب کچھ قریب قیامت ہوگا جو کہ دجال لعین کے خروج اور عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے وقت سے انتہائی قریب زمانہ ہوگا۔

تو حدیث پاک میں بتایا گیا کہ فتنۂ دہیما کا زمانہ انتہائی قرب قیامت کا زمانہ ہے جو غالباً اب تک شروع نہیں ہوا لیکن مضمون نگار کہتے ہیں کہ فتنۂ دہیما کا زمانہ دور تابعین کے بعد ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ بلکہ بعض تابعین کو بھی مولانا موصوف نے اس فتنے کے زیر اثر قرار دے دیا۔ (اس پر تحقیقی و تفصیلی بحث آگے آئے گی۔ ان شاء اللہ)

مولانا موصوف نے مضمون کی پہلی سطر میں ہی کہا کہ وہ حدیث دور فتنہ کے بارے میں ہے اور پھر یہ اقرار کیا کہ یہ آخری دور ہوگا لیکن پھر چند صفحات کے بعد اس حدیث کو قرون اولیٰ (جو کہ دورِ امن و خیر ہے) پر ہی فِٹ کر دیا جیسا کہ دوسرے اقتباس سے ظاہر ہے۔

یوں ہی مولانا موصوف نے فتنۂ دہیما کا تعین کرتے ہوئے کہا کہ یہ فکری کنفیوژن یعنی علم فقہ ہے، جب کہ اسی حدیث پاک سے ظاہر ہے کہ وہ فتنہ "فقہ" نہیں بلکہ کفر و ارتداد ہے اور کنفیوژن نہیں بلکہ نفاق (دل میں کفر چھپائے رکھنا اور زبان سے اسلام ظاہر کرنا) ہے۔

معلوم ہوا کہ مولانا موصوف نے اپنے پورے مضمون کی بنیاد حدیث کے جس ٹکڑے پر رکھی اس کا معنیٰ و مفہوم جو خود حدیث میں مذکور ہے اسے چھوڑ دیا اور بذات خود اس کی الگ توضیح و تشریح کر کے یا تو اپنی حدیث فہمی کی کمی کا پتہ دیا ہے یا پھر امت مسلمہ کو فریب دینے کے لیے ان کی آنکھوں میں دھول جھونکی ہے۔

اب اس سے پہلے کہ آپ علم فقہ کے تعلق سے مضمون نگار کی زہر افشانیوں کا مطالعہ کریں آپ کو یہ جان لینا ضروری ہے کہ **فقہ** کون سا علم ہے؟ اور اس کی ابتدا کب ہوئی؟ اور **حاملین فقہ** کون تھے؟ اور ان کا مرتبہ کیا ہے؟ اور حضور ﷺ نے ان کے لیے کون سی بشارت دی ہے؟

**"علم فقہ کیا ہے اور اس کی کتنی ضروت ہے؟"** اس تعلق سے مقدمۂ اولیٰ میں تفصیلی گفتگو ہو چکی۔ تاہم یہاں مزید کچھ اہم باتیں ذکر کی جاتی ہیں۔

مذہب اسلام ہی کا یہ طرۂ امتیاز ہے کہ اس میں ماں کی گود سے قبر تک کے سارے مسائل کا شرعی حل موجود ہے کہ کوئی بھی شخص اپنی من مانی نہیں کر سکتا اور اسی کا یعنی مکلفین (وہ لوگ جن کو اللہ نے عاقل و بالغ بنا کر شریعت کا پابند کیا) کی زندگی بھر میں پیش آنے والے مسائل کے شرعی حل کا نام **علم فقہ** ہے۔ اب وہ حل یا تو بلا واسطہ قرآن مقدس سے ثابت ہوتا ہے یا حدیث رسول سے یا پھر انھیں دونوں کے مفہوم کو مد نظر رکھتے ہوئے مومنانہ بصیرت و اجتہاد سے ہوتا ہے جسے خود رسول اللہ ﷺ نے پسند فرمایا ہے۔ لہٰذا یہ فقہ و اجتہاد کوئی نیا طریقہ نہیں بلکہ سرکار دوجہاں ﷺ ہی کے زمانے سے رائج اور محبوب ہے۔ چناں چہ حدیث پاک میں آیا ہے:

حدثنا حفص بن عمر عن شعبة عن أبي عون عن الحارث بن عمرو بن أخي المغيرة بن شعبة عن أناس من أهل حمص من أصحاب معاذ بن جبل أن رسول الله ﷺ لما أراد أن يبعث معاذا إلى اليمن قال: كيف تقضي إذا عرض لك قضاء؟ قال: أقضي بكتاب الله، قال: فإن لم تجد في كتاب الله؟ قال: فبسنة رسول الله ﷺ قال: فإن لم تجد في سنة رسول الله ﷺ ولا في كتاب الله؟ قال: أجتهد برائي ولا آلو فضرب رسول الله ﷺ

صدره فقال: الحمد لله الذي وفق رسول رسول الله ﷺ لما يرضى رسول الله.[1]

**ترجمہ:** حضرت مغیرہ بن شعبہ کے بھتیجے حارث بن عمرو نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کے حمص کے کئی اصحاب سے روایت کی کہ رسول اللہ ﷺ نے جب معاذ بن جبل کو یمن کی طرف بھیجنے کا ارداہ فرمایا تو ارشاد فرمایا: جب تمھارے سامنے کوئی مقدمہ (مسئلہ) پیش ہو تو کیسے فیصلہ کروگے؟ (کیا جواب دوگے؟) عرض کی: اللہ کی کتاب سے فیصلہ کروں گا، سرکار نے فرمایا: اگر تم اللہ کی کتاب میں نہ پاؤ؟ عرض گزار ہوئے: رسول اللہ ﷺ کی سنت (قول و فعل) کے ذریعے فیصلہ کروں گا، فرمایا اگر رسول اللہ (ﷺ) کی سنت میں بھی نہ پاؤ اور نہ ہی اللہ کی کتاب میں تو؟ عرض کی: میں اپنی رائے سے قیاس و اجتہاد کروں گا اور حقیقت تک پہنچنے میں کوئی کوتاہی نہ کروں گا، پس رسول اللہ ﷺ نے ان کے سینے کو (اس جواب کی وجہ سے) تھپکا اور فرمایا: خدا کا شکر ہے جس نے رسول اللہ ﷺ کے قاصد کو اس چیز کی توفیق دی جو اللہ کے رسول کو خوش کردے۔

علم فقہ بھی مذکورہ حدیث ہی کے محور اور ضابطے پر گردش کرتا ہے۔

مذکورہ بالا حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ فقہ و اجتہاد رسول اللہ ﷺ کے زمانے ہی سے چلا آرہا ہے، بلکہ اگر صحابۂ کرام کی سیرت کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ بہت سے اصحاب رسول صرف اسی فقہ و اجتہاد کی بنیاد پر دوسرے صحابۂ کرام پر فوقیت رکھتے تھے اور غیر فقیہ صحابہ فقیہ صحابۂ کرام کی طرف دین کے معاملے میں رجوع کیا کرتے تھے۔ فقہ و اجتہاد میں جو حضرات سر فہرست ہیں ان میں سے چند کے اسمائے گرامی یہ ہیں: (۱) حضرت صدیق اکبر (۲) فاروق اعظم (۳) عثمان غنی (۴) علی مرتضیٰ (۵) ام المؤمنین عائشہ صدیقہ (۶) عبد اللہ بن عمر (۷) عبد اللہ بن عباس (۸) زید بن ثابت (۹) ابی بن کعب (۱۰) معاذ بن جبل (۱۱) عبد اللہ بن مسعود وغیرھم رضی اللہ عنہم اجمعین۔ ان حضرات کو کتابوں میں افقہ الصحابہ (فقہائے صحابہ) کے مقدس لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔

پھر ان کے بعد تابعین کا دور آیا، اس میں بھی بہت سے لوگوں نے فقہ و اجتہاد کے عظیم

(۱)–سنن أبي داود: كتاب القضاء باب اجتهاد الرائ في القضاء، الجزء الثاني، ص: ۵۰۵

منصب کو سنبھالا۔ مثلاً: مدینہ منورہ میں عبد اللہ بن عمر کے بعد ان کی جگہ حضرت نافع نے اس عظیم منصب کو سنبھالا، پھر ان کے بعد صاحب مذہب مالکی امام مالک ان کے منصب و مسند پر فائز ہوئے۔ اہل مدینہ انھیں کی طرف امور دینیہ میں رجوع کیا کرتے تھے۔

یونہی کوفہ میں حضرت عبد اللہ بن مسعود کے بعد مسند فقہ و اجتہاد پر حضرت حماد پھر ان کے بعد صاحب مذہب حنفی امام اعظم ابو حنیفہ مسند نشیں ہوئے۔ اور عبد اللہ بن مسعود کے عہد کو مضبوطی سے تھام لیا جس کا حکم سرکار دوجہاں ﷺ نے ان الفاظ میں دیا: ”تمسکوا بعهد بن مسعود“[۱] امام اعظم خود تابعی تھے (تحقیقی بحث آگے آئے گی۔ ان شاء اللہ) اور فقہ و اجتہاد کے اعلیٰ مقام پر فائز تھے، اسی لیے لوگ آپ کی جانب رجوع کرتے، ان کے علاوہ اجلۂ تابعین میں سے کثیر افراد نے فقہ و فتویٰ سے شغف رکھا۔

اب چوتھی اور آخری بات حاملین فقہ و اجتہاد کے اجر و ثواب اور مقام و مرتبہ کو بھی ملاحظہ کریں۔ چوں کہ مجتہدین کے اجتہاد میں خطا بھی واقع ہوتی ہے جس بنا پر اختلاف بھی ہوتا ہے تو ان کی خطاے اجتہادی اور اختلاف کا انجام ملاحظہ کریں:

حدثنا عبيد الله بن عمر بن ميسرة قال: نا عبد العزيز يعني ابن محمد قال: أخبرني يزيد بن عبد الله الهاد بن محمد بن إبراهيم بن بسر بن سفيد عن أبي قيس مولىٰ عمرو بن العاص عن عمرو بن العاص قال: قال رسول الله ﷺ إذا حكم الحاكم فاجتهد فأصاب فله أجران وإذا حكم فاجتهد فأخطأ فله أجر.[۲]

**ترجمہ:** حضرت عمرو بن العاص سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب حاکم نے فیصلہ کیا اور (بساط بھر سوچ سمجھ کر) اجتہاد کر کے فیصلہ کیا اور فیصلہ درست ہو گیا تو اس کے لیے دو اجر (یعنی دوگنا ثواب) ہے اور جب اجتہاد کر کے فیصلہ کیا اور غلط واقع ہوا تو اس کے لیے ایک اجر ہے۔

اور اس امت کے علما کی کیا شان ہے! سرکار علیہ السلام فرماتے ہیں: ”العلماء

(۱)-جامع الترمذی: أبواب المناقب، ج: ۲ ص: ۲۲۱. مجلس البرکات.

(۲)-سنن أبي داود كتاب القضا، الجزء: ۲، ص: ۵۰۳، حديث: ۳۵۷۶

ورثة الأنبياء" یعنی علما انبیاے کرام کے وارث ہیں، سرکار علیہ السلام مزید ارشاد فرماتے ہیں: "علماء أمتي كأنبياء بني إسرائيل" یعنی میری امت کے علما بنی اسرائیل کے انبیا کی طرح ہیں۔

لہٰذا یہ صرف عام حاکم نہیں بلکہ امت کی دینی حکومت بھی انھیں سے وابستہ ہوتی ہے۔ صاحبان فقہ و اجتہاد کو قرآن میں بھی "اولو الأمر" یعنی حاکم کہا گیا ہے چناں چہ امام محمد بن عبد اللہ، ابو عبد اللہ حاکم نیشاپوری (متوفی ۴۰۵ھ) روایت کرتے ہیں:

حدثنا أبو زكريا يحيىٰ بن محمد العنبري ثنا محمد بن عبد السلام ثنا إسحاق بن إبراهيم أنبأ وكيع عن علي بن صالح عن عبد الله بن محمد بن عقيل عن جابر بن عبد الله " اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ج" قال: "أولى الفقه والخير" هذا حديث صحيح له شاهد وتفسير الصحابي عندهما مسند.[1]

**ترجمہ:** حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے بیان کرتے ہیں "اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ج" میں "أولى الأمر" سے مراد صاحبان فقہ و خیر (فقہا و صالحین) ہیں۔ یہ حدیث صحیح ہے جس کی نظیر موجود ہے اور صحابی کی تفسیر امام بخاری اور امام مسلم کے نزدیک مسند ہے۔[2]

اسی طرح سید المفسرین صحابی رسول حضرت عبد اللہ ابن عباس نے بھی "أولى الامر" سے مراد علما و فقہا ہی کو لیا ہے۔ (مصدر ماسبق)

صحابۂ کرام کی اس تفسیر سے جہاں فقہاے کرام کی سیادت و قیادت اور بلند مقام کا علم ہوتا ہے وہیں یہ بات بھی کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ علم فقہ کوئی نوپید چیز نہیں بلکہ علم فقہ اور فقہا دورِ صحابہ میں بھی تھے اور الحمد للہ اب تک ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے خود فقہاے مجتہدین کی تقلید و اطاعت کا حکم دیا ہے۔

اب رہی بات ائمۂ کرام کے درمیان اختلاف کی تو ان اختلافات کے بارے میں

---

(۱)- المستدرك.

(۲)- یعنی وہ حدیث مرفوع جس کی سند حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک متّصل ہو۔

سرکار مدینہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "اختلاف أمتي رحمة" یعنی میری امت کا اختلاف رحمت ہے۔

**اب آئیے مضمون کے اگلے اقتباس کا مطالعہ کریں، لکھتے ہیں:**

"ایک روایت کے مطابق پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنے اصحاب کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ میں تم کو ایک ایسے دین بیضا پر چھوڑ رہا ہوں جس کی راتیں بھی دن کی طرح روشن ہیں۔ "قد ترکتکم علی البیضاء لیلھا کنھارھا" (مسند احمد ۱۷۱۴۲) مگر بعد کے زمانے میں امت کے اندر بہت زیادہ اختلاف (اختلافًا کثیرًا) پیدا ہوجائے گا۔ اس اختلاف کثیر سے مراد وہی چیز ہے جس کو حدیث میں "فتنۂ دہیما" کہا گیا ہے یعنی قرآن و حدیث کی تشریح و تعبیر میں اختلافات سے تصور دین کا غیر واضح ہوجانا۔

**امت کی بعد کی نسلوں میں فکری اختلافات کا سبب کیا ہے؟** یہ سبب وہی ہے جو پچھلی امتوں میں پیدا ہوا۔ پچھلی امتوں کا واقعہ امت مسلمہ کے معاملے کو سمجھنے کے لیے ایک تاریخی مثال کی حیثیت رکھتا ہے، یہ حقیقت قرآن کی سورہ "البینة" میں ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے " وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ ۝۴ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۙ حُنَفَآءَ وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ ۝۵ " یعنی جو لوگ اہل کتاب تھے وہ واضح دلیل آجانے کے بعد مختلف ہوگئے حالاں کہ ان کو یہی حکم دیا گیا تھا کہ وہ اللہ کی عبادت کریں، اس کے لیے دین کو خالص کردیں یکسو ہوکر، اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں اور یہی درست دین ہے۔

پچھلی امتوں میں جو واقعہ پیش آیا وہ یہ تھا کہ ان کو اللہ کی کتاب دی گئی تھی لیکن ان کی بعد کی نسلوں کے درمیان کتاب کی تشریح و توضیح میں علما کے درمیان اختلافات پیدا ہوئے، ان اختلافات کی بنا پر امت مختلف گروہوں میں بٹ گئی۔ اختلاف کا یہی واقعہ فطرت کے قانون کے مطابق امت مسلمہ کی بعد کی نسلوں میں پیش آئے گا۔ دونوں کا مشترک سبب ایک ہے۔

یہ معاملہ کیوں پیش آتا ہے؟ اس کا سبب یہ ہے کہ امت کی ابتدائی نسل میں دین اپنی اسپرٹ کے اعتبار سے زندہ ہوتا ہے، لوگوں پر یہ بات واضح ہوتی ہے کہ دین اصلاً اسپرٹ کا نام ہے، جہاں تک اس کی ظاہری صورت یا فارم (Form) کا تعلق ہے وہ دین کا ایک اضافی حصہ (Relative part) ہے، یہ ایک حقیقت ہے کہ اسپرٹ میں ہمیشہ یکسانیت ہوتی ہے اس لیے امت جب تک اسپرٹ والے دین پر قائم ہو اس وقت تک اس کا اتحاد باقی رہتا ہے لیکن بعد کے دور میں زوال کی بنا پر اسپرٹ مفقود ہو جاتی ہے اور لوگ دین کے فارم کو اصل دین سمجھ لیتے ہیں، چوں کہ فارم میں ہمیشہ اختلاف ہوتا ہے، اس لیے امت جب زوال کا شکار ہو کر جب فارم پر قائم ہو جاتی ہے تو ہمیشہ اختلافات پیدا ہوتے ہیں۔ پہلے اختلاف آتا ہے اور پھر فرقہ بندی ہوتی ہے اور پھر مختلف گروہوں کے درمیان تشدد شروع ہو جاتا ہے۔" (الرسالہ اگست ۲۰۱۵ ص: ۱۱ تا ۱۳)

**مذکورہ بالا اقتباس کا خلاصہ یہ ہے:**

- فتنۂ دہیما سے مراد قرآن و حدیث کی تشریح و تعبیر میں اختلاف پیدا ہونا۔
- پچھلی امتوں میں بھی فرقہ بندی کی وجہ یہی اختلافات تھے یعنی کتاب اللہ کی تشریح و تعبیر میں اختلاف۔
- یہ اختلافات اسلامی اسپرٹ کے فقدان کی وجہ سے پائے جاتے ہیں۔

ان سب اختلافات سے مولانا نے فقہی اختلافات مراد لیے ہیں۔ تو اب آئیے حقائق کے آئینے میں ان کا جائزہ لیں:

پچھلی امتوں میں تفرقہ کا سبب کتاب اللہ کی اخلاص کے ساتھ تشریح و تعبیر میں اختلاف نہیں بلکہ اختلاف و افتراق کے اسباب متعدّد ہیں۔ جیسا کہ قرآن و حدیث کے علوم جاننے والوں پر یہ بات واضح ہے کہ پچھلی امتوں نے کبھی حضرت عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا بنا لیا تو کبھی عیسیٰ علیہ السلام کو ابن اللہ کہا، کبھی ثالث ثلثۃ کے قائل ہوئے تو کبھی کفر و شرک میں مبتلا ہوئے اور اپنے نفس کے مطابق کتاب اللہ کی غلط توضیح و تشریح کی اور اس میں حذف و اضافہ کر دیا۔ چناں چہ قرآن میں آیا ہے: "یُحَرِّفُوْنَ الْکَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِہٖ

”[۱]یعنی وہ لوگ کتاب اللہ کے کلمات کو اپنی جگہوں سے ہیر پھیر کر دیتے تھے۔ اور اس طرح ہر قبیلے کے افراد اپنے پاس موجود کتاب اللہ کے نسخوں میں تحریف کرتے رہتے۔

ابوداؤد شریف کی حدیث:۴۳۳۶ اور ترمذی شریف کی حدیث:۳۰۵۰ کے مطابق بنی اسرائیل میں جو پہلی کمی داخل ہوئی وہ یہ ہے کہ جب کوئی شخص دوسرے کو برائی کرتے ہوئے دیکھتا تو کہتا کہ اے شخص! اللہ سے ڈر اور اپنے کرتوت سے باز آجا کیوں کہ یہ تیرے لیے حلال نہیں۔ پھر دوسرے دن جب اسی شخص سے ملتا اور اپنے حال میں پاتا تو اسے اس فعل بد سے نہ روکتا بلکہ خود ان برائی کرنے والوں کی صحبت اختیار کرلیتا۔ تو جب ان بنی اسرائیلیوں نے یہ رویّہ اپنا لیا تو اللہ نے ان کے دلوں کو آپس میں ٹکرا دیا اور ان میں اختلاف پیدا ہوگیا۔

اس کے بعد حضور ﷺ نے سورۃ المائدہ کی آیت:۷۸ تا ۸۱/ ”لُعِنَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَ عِیْسَى ابْنِ مَرْیَمَ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّ كَانُوْا یَعْتَدُوْنَ ۝۷۸ كَانُوْا لَا یَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا یَفْعَلُوْنَ ۝۷۹ تَرٰى كَثِیْرًا مِّنْهُمْ یَتَوَلَّوْنَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا ؕ لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ اَنْ سَخِطَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ وَ فِی الْعَذَابِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ۝۸۰ وَ لَوْ كَانُوْا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ النَّبِیِّ وَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مَا اتَّخَذُوْهُمْ اَوْلِیَآءَ وَ لٰكِنَّ كَثِیْرًا مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝۸۱“ [۲] کی تلاوت فرمائی جس میں اللہ نے داؤد اور عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کی زبانی بنی اسرائیل پر لعنت فرمائی اور انھیں کافر کہا۔

بہر حال مضمون نگار نے سورۃ البینۃ کی جو آیت پیش کی ہے مفسرین کرام نے اس آیت کی تشریح اس طرح کی ہے کہ آیت مذکورہ میں ”بینۃ“ سے مراد رسول اللہ ﷺ اور قرآن مجید ہے اور سرکار ﷺ کے تشریف لانے سے پہلے اہل کتاب یہود و نصاریٰ حضور ﷺ پر ایمان لانے کے سلسلے میں متفق تھے لیکن جب آپ (ﷺ) قرآن لے کر تشریف لائے تو وہ مختلف ہوگئے اور نبی پاک ﷺ کی نبوت کا انکار کر بیٹھے حالاں کہ وہ رسول اللہ ﷺ میں ان تمام اوصاف کو واضح طور پر پاتے تھے جو انھیں توریت و انجیل میں

(۱)-النساء: ٤٦

(۲)-المائدة: من ٨٧ إلى ٨١.

بتائے گئے تھے۔ لہٰذا مفسرین کرام کی مذکورہ توضیح کے لحاظ سے آیت کریمہ میں کتاب اللہ کی توضیح وتشریح سے متعلق کوئی تذکرہ نہیں۔ اور غور کریں کہ ایسے دو فرد جو اپنی ذاتی مفاد سے دور مسلمانوں کے دینی مسائل کے حل کی خاطر قرآن میں غور وتدبر سے مسائل کا استنباط کریں اور اس میں خطا واقع ہونے کی بنا پر دوسرے مجتہد سے اختلاف ہوجائے تو وہ کیوں کر ماخوذ ہو سکتا ہے بلکہ حدیث رسول کے مطابق وہ خطا کرنے والا مجتہد بھی ثواب کا مستحق ہوگا۔

امت مسلمہ میں جن لوگوں نے عقائد میں اختلاف کیا اور عام مسلمانوں کی روش سے انحراف کیا وہ لوگ یقیناً قابل مذمت اور لائق عذاب ہیں لیکن رہی بات شرعی مسائل میں فقہی اور فروعی اختلاف کی تو یہ حدیث کے مطابق رحمت ہے کیوں کہ یہ اختلافات صحابہ اور تابعین کے اندر بھی موجود تھے لیکن !!!

مضمون نگار نے کہا کہ " جب اسپرٹ باقی رہتی ہے تو اتحاد باقی رہتا ہے اور جب اسپرٹ ختم ہوجاتی ہے تو اختلاف ہوتا ہے۔" ہمیں اس پر یہ کہنا ہے کہ صحابۂ کرام کے اندر بھی تو اختلاف ہوا؛ اس کی دو مثالیں ملاحظہ کریں:

**مثال نمبر(۱):** جب متوفیٰ عنہا زوجہا (وہ عورت جس کا شوہر مرگیا ہو) حاملہ ہو تو وہ کون سی عدت گزارے؛ عدت وفات (یعنی چار مہینے دس دن) یا عدت حمل؟ (یعنی وضع حمل) اس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں وہ عورت أبعد الأجلین (یعنی عدت وفات اور عدت حمل میں جو زیادہ ہو) پر عمل کرے گی تاکہ قرآن کی دونوں آیتوں پر عمل ہوجائے۔ **پہلی آیت:** "وَالَّذِیْنَ یُتَوَفَّوْنَ مِنْکُمْ وَ یَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا یَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّ عَشْرًا ج "(۱) یعنی وہ لوگ جو تم میں سے وفات کر جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں تو وہ (عورتیں) چار مہینے دس دن اپنے آپ کو روکے رکھیں یعنی چار ماہ دس دن عدت گزاریں۔

**دوسری آیت:** وَ اُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ یَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ط(۲) یعنی اور حمل والیوں کی عدت یہ ہے کہ وہ اپنے حمل جن دیں۔

اور حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا موقف یہ ہے کہ حمل والی عورت کی عدت

(۱)- البقرۃ: ۲۳٤

(۲)-الطلاق: ٤

وضع حمل ہے خواہ وہ متوفیٰ عنہا زوجہا ہو یا مطلقہ کیوں کہ " وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ الآية" یہ آیت کریمہ پہلے نازل ہوئی اور " وَ اُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ؕ" بعد میں نازل ہوئی ہے، لہٰذا پہلی آیت حاملہ متوفیٰ عنہا زوجہا کے حق میں منسوخ ہے اور دوسری آیت ناسخ ہے۔[1]

**مثال نمبر۲:** قصاص عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے تعلق سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم اور کاتب وحی حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے درمیان اختلاف ہوگیا یہاں تک کہ اسی اختلاف کی پاداش میں جنگ صفین ہوئی اور اس جنگ میں تقریبًا ۶۵ / سے ۷۰ / ہزار مسلمان شہید ہوئے، ہزاروں عورتیں بیوہ اور لاکھوں بچے یتیم ہوئے۔ (یہ واقعہ عامۂ کتب تاریخ میں مذکور ہے مثلاً تاریخ طبری اور اخبار الطوال وغیرہ)

تو اب یہ بتائیں کہ صحابۂ کرام کے اس اختلاف اور دو گروہوں میں تقسیم ہوکر آپس میں جنگ کرنے کی بنیاد پر کیا **انھیں یہ کہا جائے گا کہ ان کے اندر اسلامی اسپرٹ ختم ہوچکی تھی؟** (نعوذ باللہ من ذلک)

یوہی **پہلی مثال** میں کیا یہ کہا جائے گا کہ حضرت علی اور حضرت عبد اللہ بن مسعود کے درمیان کتاب اللہ کی توضیح وتشریح میں اختلاف ہوا اور کچھ لوگوں نے حضرت علی کے قول کو اپنایا اور کچھ نے عبد اللہ بن مسعود کے موقف کو اور اس طرح لوگ گروہوں میں بٹ گئے، **لہٰذا یہ دونوں حضرات (علی، عبد اللہ بن مسعود) کے اندر سے اسلامی اسپرٹ ختم ہوچکی تھی اور انھوں نے فارم ہی کو اصل دین سمجھ لیا تھا اور وہ فتنۂ دہیما کے شکار تھے اور دین بیضا کے دین غیر بیضا بن جانے کا اصل سبب انھیں جیسے لوگوں کا اختلاف ہے؟** ملاحظہ کریں لکھتے ہیں:

> "دین میں اسپرٹ کے بجائے فارم کو اہمیت دینے کا یہ فقہی طریقہ بعد کے لوگوں کے لیے ایک رجحاں ساز (Trendsetter) واقعہ بن گیا۔ اس کے بعد دینی موضوعات پر جو کتابیں لکھیں گئیں وہ تقریبًا سب کی سب اسی نہج پر لکھی گئیں۔ یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ **دین بیضا کا دین غیر بیضا بن جانے کا اصل سبب یہی ہے۔** (الرسالہ اگست ۲۰۱۵ ص: ۱۶)"

(۱)- التوضیح: ص: ۶۲ مجلس برکات

بہرحال اب ہم تحریر کے اگلے حصے کا جائزہ لیں گے۔ مضمون نگار نے دین بیضا کو دین غیر بیضا بنانے والے اختلافات کی ایک مثال پیش کی ہے ملاحظہ کریں:

''اس معاملے کی ایک مثال یہ ہے کہ ایک حدیث رسول میں آیا ہے: ''لا صلوٰۃ إلا بفاتحۃ الکتاب (مسند أحمد حدیث: ۲۲۶۷۱) یعنی سورۃ الفاتحہ کے بغیر کوئی نماز، نماز نہیں۔ پیغمبر اسلام صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کا یہ ارشاد صحابہ کے زمانے میں بھی لوگوں کو معلوم تھا، لیکن اس کی بنا پر لوگوں کے درمیان کوئی اختلاف پیدا نہیں ہوا کیوں کہ اس زمانے میں اسپرٹ بھرپور طور پر زندہ تھی۔ لوگ سمجھتے تھے کہ اصل چیز یہ ہے کہ حالت نماز میں سورۃ الفاتحہ کے معانی کی یاد دہانی ہوتی رہے، سری نمازوں میں ہر آدمی خود سورۃ الفاتحہ پڑھتا تھا اور جہری نمازوں میں ہر آدمی یہ سمجھتا تھا کہ امام کی زبان سے سورۃ الفاتحہ کو سن کر قراءت فاتحہ کا مقصد نیابتاً حاصل ہو گیا۔

لیکن بعد کے زمانے میں جب امت کے اندر زوال آیا اور ساری اہمیت عبادت کے فارم کو دی جانے لگی اسی وقت اس حدیث کو لے کر لوگوں کے درمیان زبردست اختلاف پیدا ہو گیا۔

ایک گروہ نے کہا کہ جہری نماز میں سورۃ الفاتحہ کی نیابتاً ادائیگی کافی ہے، دوسرے گروہ نے کہا کہ نہیں، ہر مصلی کو لازماً اپنی نماز میں ذاتی طور پر سورۃ الفاتحہ پڑھنا چاہیے، حتی کہ جہری نمازوں میں جب کہ امام بلند آواز سے قراءت کر رہا ہو تب بھی مقتدیوں پر لازم ہے کہ وہ آہستہ آہستہ سورۃ الفاتحہ پڑھیں ورنہ ان کی نماز نہیں ہوگی۔'' (الرسالہ اگست ۲۰۱۵ ص: ۱۳)

☆ جناب نے اختلاف تو بیان کر دیا لیکن وجہ اختلاف بیان نہیں کی۔

☆ اپنے اس قول پر کوئی دلیل نہیں دی کہ '' دور صحابہ میں ہر آدمی سری نمازوں میں سورۂ فاتحہ پڑھتا تھا۔'' اور اس پر بھی کوئی دلیل نہ دی کہ سارے لوگ جہری نماز میں امام کے پیچھے امام کی قراءت فاتحہ پر اکتفا کر لیتے۔

☆ قراءت خلف الامام یعنی امام کے پیچھے قراءت کرنے یا نہ کرنے کا اختلاف صحابۂ کرام کے

زمانے میں نہیں تھا بلکہ بعد میں جب امت زوال پذیر ہوئی تب واقع ہوا۔

تو آئیے ہم ان امور کا تحقیقی مطالعہ کرتے ہیں:

**(۱)-اختلاف کی وجہ کیا ہے؟** حدیث پاک میں آیا ہے کہ حضرت ابو سائب نے فرمایا کہ میں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو فرماتے سنا کہ سرکار دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے نماز پڑھی اور سورۂ فاتحہ نہ پڑھی تو وہ نماز ناقص ہے ناقص ہے ناتمام ہے۔ حضرت ابو سائب کہتے ہیں کہ میں نے حضرت ابو ہریرہ سے کہا کہ اے ابو ہریرہ! میں کبھی امام کے پیچھے ہوتا ہوں۔ (ابو سائب کہتے ہیں کہ) ابو ہریرہ نے میرے بازو کو پکڑ کر جھنجھوڑا اور کہا: اے فارسی! تو اسے (یعنی سورۂ فاتحہ کو) اپنے دل میں (آہستہ آہستہ) پڑھ، بے شک میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اللہ عزوجل نے فرمایا: نماز میرے اور میرے بندے کے درمیان تقسیم شدہ ہے؛ نصف میرے لیے اور نصف میرے بندے کے لیے اور میرے بندے کے لیے وہ ہے جو اس نے مانگا۔ الخ۔ (۱)

اور ایک حدیث پاک میں ہے: عن جابر بن عبد الله عن النبي ﷺ أنه قال: من صلى خلف الإمام فإن قراءة الإمام له قراءة. (۲)

**ترجمہ:** حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو شخص امام کے پیچھے نماز پڑھے تو امام کی قراءت خود اسی کی قراءت ہے۔

**(۲-۳)** حدیث پاک میں ہے: حضرت اسامہ بن زید مزنی فرماتے ہیں کہ ہم سے سالم بن عبد اللہ بن عمر نے حدیث بیان کی کہ ابن عمر امام کے پیچھے قراءت نہیں کرتے تھے، حضرت اسامہ کہتے ہیں تو میں نے قاسم بن محمد (یہ صحابی رسول محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہما کے بیٹے ہیں) سے قراءت خلف الامام کے بارے میں دریافت کیا تو انھوں نے فرمایا: اگر تم اسے (قراءت خلف الامام) چھوڑ دو تو یقیناً اسے ایسے لوگوں نے چھوڑا ہے جن کی اقتدا کی جاتی ہے اور اگر قراءت کرو (امام کے پیچھے) تو کچھ ایسے لوگوں نے قراءت کی ہے جن کی اقتدا کی جاتی ہے۔ (۳)

---

(۱)- مؤطا الإمام محمد: باب القراءة في الصلوٰة خلف الإمام ص: ۹۶۔ مجلس برکات۔

(۲)- أيضًا ص: ۹۸

(۳)- أيضًا ص: ۹۹

بیان کردہ احادیث کریمہ سے معلوم ہوا کہ ہر آدمی امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ نہیں پڑھتا تھا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ اختلاف صحابۂ کرام کے دور میں بھی موجود تھا، نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ کچھ لوگ ایک جماعت کی تقلید و اقتدا کرتے تھے اور کچھ لوگ دوسرے گروہ کی اطاعت و تابعداری۔

اب ہم مدیر ''الرسالہ'' سے کہتے ہیں کہ اپنے جملے چست کیجیے ان صحابۂ کرام کے اختلاف پر اور کہیے کہ یہی اختلاف فتنۂ دہیما اور دین بیضا کو دین غیر بیضا بنانے کا اصل سبب ہے جو اسلامی اسپرٹ کے فقدان کی وجہ سے پایا گیا۔ (نعوذ باللہ من ذلک) اب کیا موصوف اپنی غلطی کا اعتراف کریں گے یا اپنی بات پر اڑے رہیں گے؟

## تاریخ سے کھلواڑ اور حدیث کے مفہوم کی غلط بیانی

### مولانا وحید الدین خاں لکھتے ہیں:

### امت کا فکری زوال

''ایک حدیث رسول میں بتایا گیا ہے کہ ''خير أمتي قرني ثم الذين يلونهم ثم الذين يلونهم'' (صحیح بخاری حدیث: ۳۶۵۰) اس حدیث رسول میں اسلام کے تین ادوار کو خیر کے ادوار کہا گیا ہے۔ ان ادوار کو قرون ثلاثہ یا قرون مشہود لھا بالخیر کہا جاتا ہے۔ ان تین ادوار سے مراد ہے عہد رسالت، عہد صحابہ، عہد تابعین۔ ان تین ادوار کی مدت پیغمبر اسلام ﷺ کی وفات (۶۳۲ء) کے بعد تقریباً ایک سو سال تک جاری رہی، اس کے بعد وہ دور شروع ہو گیا جو قرون مشہود لہا بالخیر کے بعد کا دور تھا، گویا کہ اسلام کی تاریخ میں مستند ادوار صرف ابتدائی تین ادوار ہیں، بعد کے ادوار کو اسلام میں مستند حیثیت حاصل نہیں۔

اس مسئلے کی مزید تعیین کی جائے تو کہا جائے گا کہ اسلام کے تین ادوار میں اسلام کا فکری مرجع تمام تر قرآن تھا۔ ثانوی مرجع کے طور پر حدیث بھی اس میں شامل ہے کیوں کہ حدیث قرآن کی تشریح ہے، حدیث کے بغیر قرآن کو درست طور پر سمجھنا ممکن نہیں تقریباً سو سال بعد اسلام کی تاریخ میں ایک نیا دور شروع ہوا جس کو فقہی دور کہا جاتا ہے، یہ وہ دور ہے کہ جب ساسانی ایمپائر اور بازنطینی ایمپائر

کے علاقے فتح ہوئے اور بتدریج اس علاقے کے لوگ اسلام میں داخل ہونا شروع ہوئے، اس کے بعد اسلام کی تاریخ میں ایک نیا ظاہرہ پیدا ہوا جس کو عمومی قبول اسلام (Mass conversion) کہا جاتا ہے، یہ لوگ اسلام سے پہلے مجوسی مذہب یا مسیحی مذہب میں شامل تھے۔ ان تمام مذاہب میں اس وقت ساری اہمیت صرف فارم کو دی جاتی تھی، ان لوگوں نے اسلام قبول کیا تو اپنے قدیم مائنڈسیٹ (Mindset) کے تحت وہ یہ جاننے کی کوشش کرنے لگے کہ اسلام کا فارم کیا ہے؟ یہی وہ دور ہے جب کہ اسلام کی تاریخ میں وہ شعبہ پیدا ہوا جسے فقہ کہا جاتا ہے۔" (الرسالہ اگست ۲۰۱۵ ص:۱۴-۱۵)

آگے مسئلے کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"**وضوح کا مسئلہ:** اسلام کے دور اوّل (قرون مشہود لہا بالخیر) میں دین کا یہی تصور غالب تصور کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کے بعد دھیرے دھیرے اس میں کمی شروع ہوئی اور پھر وہ وقت آیا کہ جب کہ عمومی طور پر دین کا تصور گم ہوگیا۔ عمر بن عبد العزیز (وفات: ۷۲۰ء) غالباً اسلام کے دور اوّل کے آخری شخص ہیں۔"

(الرسالہ اگست ۲۰۱۵ ص:۲۱)

**مذکورہ بالا گفتگو کا خلاصہ:**

- پہلے اقتباس میں مذکور حدیث پاک میں خیر القرون کا مطلب "عہد رسالت، عہد صحابہ، عہد تابعین "تبع تابعین کا دور خیر القرون میں داخل نہیں۔
- قرون ثلاثہ کی مدت سرکار ﷺ کی وفات کے بعد تقریباً سو سال ہے مکمل سو سال بھی نہیں۔
- قرون ثلاثہ کی آخری شخصیت عمر بن عبد العزیز ہیں جن کی وفات حضور ﷺ کی وفات کے ۹۲/ سال بعد ہوئی۔ پھر ان کے بعد فتنۂ دہیما کا زمانہ شروع ہوگیا۔
- قرون ثلاثہ کے بعد اسلام میں فقہ کا شعبہ پیدا ہوگیا۔ اور حاملین فقہ قرون اولیٰ میں موجود نہ تھے۔

علم فقہ قرون اولیٰ میں بھی تھا۔ اس کے تعلق سے آپ نے پیچھے صحابی رسول حضرت

جابر بن عبد اللہ کی حدیث آیت کریمہ کی تفسیر سے متعلق پڑھی کہ ” اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ ج “ میں ”أولی الأمر“ سے مراد صاحبان فقہ وخیر ہیں۔

بہر حال اب ہم قرون ثلاثہ کی تحقیق پیش کرتے ہیں جیسا کہ ہم نے پیچھے وعدہ کیا تھا:

موصوف نے جو مطلب بیان کیا وہ یا تو ان کی جہالت ہے یا پھر **تجاہل عارفانہ** (یعنی جان بوجھ کر غلطی کرنا) انھوں نے حدیث کا ترجمہ بھی نہیں کیا کہ کم خواندہ حضرات بھی کہیں اس حدیث کا صحیح معنیٰ نہ سمجھ لیں۔ لیکن عربی پڑھے لکھے حضرات کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ ”ثم الذین یلونھم“ جو حدیث پاک میں پہلی مرتبہ ذکر ہوا ہے اس میں ”ھم“ کی ضمیر ان لوگوں کی طرف لوٹ رہی ہے جو عہد رسالت میں تھے یعنی صحابۂ کرام۔ اور ان سے ملنے والے لوگ تابعین ہوں گے پھر ”ثم الذین یلونھم“ جو حدیث پاک میں دوسری مرتبہ مذکور ہے اس میں ”ھم“ کی ضمیر ان لوگوں کی طرف لوٹ رہی ہے جو عہد صحابہ میں تھے یعنی تابعین تو ان (تابعین) سے ملنے والے حضرات تبع تابعین ہوں گے۔

لہٰذا عربی سے ناواقف حضرات کے لیے پہلے ہم اس حدیث کا واضح ترجمہ کر دیتے ہیں:

”میری بہترین امت میرے زمانے کے لوگ (یعنی صحابہ) ہیں پھر جو ان سے ملے (یعنی تابعین) پھر جو ان سے متّصل ہوں (یعنی تبع تابعین، ان سب کے دامن سے وابستہ رہو)

اب بات واضح ہوگئی کہ قرون ثلاثہ میں تبع تابعین بھی داخل ہیں۔ پھر بھی کوئی شخص ہماری اس گفتگو کو لفظی موشگافی کا نام دے سکتا ہے تو اطمینان کے لیے ہم ایک اور حدیث پیش کرتے ہیں جس کے بعد پھر لیت و لعل کی گنجائش باقی نہیں رہے گی۔ ملاحظہ کریں:

عن ابن عمر قال: خطبنا عمر بالجابیة فقال: أیھا الناس! إنی قمت فیکم کمقام رسول اللہ ﷺ فینا فقال: أوصیکم بأصحابی ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونھم...الخ.[1]

**ترجمہ:** حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہین: حضرت عمر نے مقام جابیہ میں ہم سے خطاب فرمایا تو کہا اے لوگو! میں تمھارے درمیان ویسے ہی ٹھہرا ہوں جیسے رسول اللہ ﷺ

(۱)- جامع الترمذی: کتاب الفتن، باب لزوم الجماعة ص: ۳۹ مجلس برکات.

ہمارے درمیان کھڑے ہوئے تھے۔ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: میں تمھیں اپنے صحابہ کے دامن کو مضبوطی سے پکڑے رہنے کی وصیت کرتا ہوں پھر جو ان سے متّصل ہوں (تابعین) پھر جوان سے متّصل ہوں (تبع تابعین)۔

اب بات اظہر من الشمس (سورج سے زیادہ روشن) ہوگئی کہ قرون ثلاثہ (۱) عہد رسالت وصحابہ (۲) عہد تابعین (۳) عہد تبع تابعین تینوں کو شامل ہے اور تینوں ادوار کے خیر ہونے کی بشارت خود سرکار ﷺ نے دی ہے۔ ان تینوں ادوار کی مدت کم از کم ۲۰۰ھ تک ضرور ہوگی۔

لیکن موصوف نے ان تینوں زمانوں کی مدت، وفات عمر بن عبد العزیز یعنی ۱۰۱ھ تک سمیٹ کر رکھ دی اور اس طرح تبع تابعین کا طبقہ تو خارج ہوا ہی ساتھ میں کچھ مشہور تابعین بھی موصوف کے مطابق قرون ثلاثہ یا قرون مشہود لہا بالخیر سے خارج ہوگئے کیوں کہ موصوف نے حضور ﷺ کی وفات کے بعد صرف ۹۲/سال خیر القرون قرار دیا۔ اب ایک ناقابل انکار حقیقت ملاحظہ کریں:

امام محمد بن محمد کردری رحمۃ اللہ علیہ (وفات: ۸۲۷ھ) نے روے زمین میں سب سے آخر میں وفات پانے والے صحابی رسول حضرت ابوالطفیل عامر بن واثلہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں لکھا ہے:

ومات بمكة سنة اثنين ومائة وهو آخر من مات من الصحابة في جميع الأرض ولم يبق بعده صحابي علي وجه الأرض، عليه اتفق المحدثون و يدل عليه الأحاديث المخرجة في الصحاح.[۱]

**ترجمہ:** اور حضرت ابوالطفیل عامر بن واثلہ رضی اللہ عنہ کی وفات مکہ مکرمہ میں ۱۰۲ھ میں ہوئی اور یہ پوری دنیا میں سب سے آخر میں وفات پانے والے صحابی رسول ہیں، ان کے بعد روے زمین پر کوئی بھی صحابی باقی نہ رہے۔ اس پر محدثین کا اتفاق ہے اور صحاح ستہ کی حدیثیں بھی اس پر دلالت کرتی ہیں۔

غور کریں! حضور ﷺ کی وفات ۱۰ھ میں ہوئی اور آخری صحابی رسول حضرت ابو

(۱)- مناقب الأمام الأعظم للكردري ص: ٤٥٥ مطبوعة الجامعة الأشرفية.

الطفیل عامر بن واثلہ رضی اللہ عنہ کی وفات ۱۰۲ھ میں ہوئی، لہٰذا درمیانی مدت ۹۲/سال ہوئی۔ یعنی اسلام کے خیر وبرکت والے تین ادوار میں سے پہلے دور کا اختتام سرکار صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے ۹۲/سال بعد ہوا، پھر دوسرا دور شروع ہوا پھر اس کے بعد تیسرا دور۔ لیکن مولانا وحید الدین نے ۹۲/سال میں تینوں ادوار کا خاتمہ کر دیا۔

قارئین! اب آپ خود ہی فیصلہ کریں کہ الرسالہ کے ایڈیٹر صاحب نے تاریخ کے ساتھ کیسا کھلواڑ کیا ہے!

بہر حال جب صحابیِ رسول حضرت ابو الطفیل رضی اللہ عنہ کی وفات ۱۰۲ھ میں ہوئی تو جن لوگوں نے آپ کی زیارت کی وہ تابعی ہوں گے۔ اور یہ ظاہر سی بات ہے کہ آپ چوں کہ سب سے آخری صحابی ہیں تو اس زمانے میں آپ کی مقبولیت کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا، ہر ایک آپ سے اکتسابِ فیض کے لیے کوشاں رہا ہوگا۔ ان میں وہ نونہال بھی تھے جنھوں نے ابھی ابھی ہوش سنبھالا تھا، کسی کی عمر چار، پانچ سال تو کسی کی آٹھ دس سال رہی ہوگی۔ اور یہ سب تابعی ہوئے۔ اب ان نونہالوں کی عمر کم از کم ۶۰/سال بھی مانیں تو دورِ تابعین (خیر القرون میں سے دوسرا سے دور) کم از کم ۱۵۰/سال تک توماناہی جائے گا۔ یہ تو عقلی دلیل ہوئی اب دلائل نقلیہ بھی ملاحظہ کریں:

امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کی ولادت ۸۰ھ میں ہوئی۔ (۱) یہ صحابۂ کرام کا دور تھا، آپ نے متعدّد صحابۂ کرام کی زیارت کی ان میں چار صحابۂ کرام سے ملاقات پر محدثین کا اتفاق ہے (۲) ان کے اسمائے گرامی مندرجہ ذیل ہیں:

**(۱)- خادمِ رسول حضرت انس بن مالک انصاری** (وفات: اختلاف روایت کے ساتھ ۹۱ یا ۹۹ھ میں بصرہ میں ہوئی۔)

**(۲)- عبد اللہ بن ابی اوفیٰ علقمہ بن قیس** (وفات: ۸۶ھ یا ۸۷ھ)

**(۳)- سہل بن سعد ساعدی انصاری** (وفات اختلاف روایت کے ساتھ ۸۸ھ یا ۹۱ھ)

**(۴)- ابو الطفیل عامر بن واثلہ** (وفات: ۱۰۲ھ)

(۱)- مناقب الإمام الأعظم للموفق ص: ۲۷. سیر أعلام النبلاء للذهبي.

(۲)- مناقب الإمام الأعظم للكردري ص: ٤٧

ان کے علاوہ امام حافظ الدین محمد بن شہاب الکردری (وفات: ۸۲۷ھ) نے مناقب الامام الاعظم میں اور چند نام ذکر کیے ہیں: **(۵) عبداللہ بن الحارث بن جزء الزبیدی (۶) واثلہ بن اسقع (۷) معقل بن یسار (۸) جابر بن عبداللہ انصاری (۹) عبداللہ بن انیس (۱۰) عائشہ بنت عجرد**۔ رضی اللہ عنہم اجمعین (مرجع سابق)

حافظ ابن کثیر نے "البدایہ والنہایہ" میں ان صحابۂ کرام کی تعداد سات بتائی ہے جن سے امام اعظم نے ملاقات کی ہے۔ یہ بات واضح رہے کہ یہ کتاب "البدایہ والنہایہ" وہی ہے جس کا حوالہ خود مولانا وحید الدین دیا کرتے ہیں۔ (**دیکھیے الرسالہ اگست ۲۰۱۵ ص: ۲۱**)

بہرحال دلائل وشواہد اور تاریخ کی روشنی میں ثابت ہو گیا کہ امام اعظم اور آپ کے رفقا سب کے سب خیر القرون میں سے ہیں اور اس آیت کریمہ کے تحت داخل ہیں:

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَ الْاَنْصَارِ وَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ ۙ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ وَ اَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَاۤ اَبَدًا ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۰۰﴾ (التوبۃ)

**ترجمہ:** اور سابقین اولین مہاجرین وانصار اور جو بھلائی کے ساتھ ان کے متبع ہوئے ان سے اللہ راضی ہے اور وہ لوگ اللہ سے راضی ہیں اور اللہ نے ان کے لیے ایسی جنت تیار کی ہے جس کے نیچے نہریں جاری ہیں۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہی بڑی کامیابی ہے۔

لہٰذا علم فقہ کو خیر القرون کے بعد کی پیداوار قرار دینا سراسر غلط اور خلاف واقع ہے۔

## فروعی اختلافات صحابہ کے دور میں بھی تھے ان کو فتنہ کہنا بڑی نادانی ہے

وحید الدین صاحب نے فقہی اختلافات کو فتنہ قرار دیا اور کہا کہ یہ اختلافات صحابہ کے زمانے میں نہ تھے۔ اب ہم ایک اقتباس پیش کرتے ہیں جس میں خود موصوف نے اقرار کیا ہے کہ یہ اختلافات صحابہ کے زمانے میں بھی تھے:

"یہی وہ زمانہ ہے جب کہ حدیثوں کی جمع وتدوین شروع ہوئی۔ فقہا نے فارم کے بارے میں لوگوں کے سوالات کے جوابات معلوم کرنے کے لیے حدیثوں کو دیکھا۔ احادیث کے ذخیرہ میں مختلف صحابہ کی زبان سے یہ بتایا گیا تھا کہ رسول اللہ

صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمْ کس طرح عبادت کرتے تھے۔ فقہا کو معلوم ہوا کہ اس معاملے میں صحابہ کی روایتیں مختلف ہیں۔ مثلاً کسی صحابی کی روایت آمین بالسر کے حق میں تھی تو کسی کی روایت آمین بالجہر کے حق میں تھی۔ احادیث کے ذخیرے میں اس طرح کے کثیر اختلاف موجود تھے۔"

"مدعی لاکھ پہ بھاری ہے گواہی تیری" مذکورہ بالا اقتباس سے ثابت ہوا کہ فروعی مسائل میں اختلاف صحابہ کے زمانے میں بھی تھا۔ بہر حال اس اقتباس سے آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ اس زمانہ کے علما کا امتِ مسلمہ پر بہت بڑا احسان ہے کہ انھوں نے احادیث کی جمع و تدوین کر کے اسلام کا وہ خطیر اثاثہ آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ کر دیا جس کے بغیر قرآن کو سمجھنا بھی ممکن نہیں۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ جب فقہاے کرام سے دین کے متعلق سوالات کیے گئے تو انھوں نے من مانی نہیں کی بلکہ احادیث کی جانب رجوع کیا یعنی انھوں نے عین قرآن و حدیث پر عمل کیا۔ ان تمام باتوں کا موصوف کو خود اقرار ہے تاہم موصوف نے ان بزرگوں کو فتنہ پرور قرار دیا۔ اس سے تو یہی سمجھ میں آتا ہے کہ نہ چاہتے ہوئے بھی فقہاے کرام کی حقانیت پر دلالت کرنے والے جملے موصوف کی تحریر کا حصہ بن گئے۔ الحق یعلو و لا یُعلی.

یہ بھی معلوم ہوا کہ فقہاے کرام کے درمیان اختلاف اس لیے ہوا کہ "مختلف صحابہ کی زبان سے مختلف قسم کی حدیثیں بتائی گئی تھیں اور احادیث کے ذخیرے میں کثیر اختلافات موجود تھے" بہر حال ان فقہاے کرام میں سے بعض نے کسی ایک صحابی کی روایت لی اور بعض نے کسی دوسرے کی۔ بہر صورت وہ تمام حضرات حق پر رہے کیوں کہ حدیث پاک میں آیا ہے: أصحابي کالنجوم فبأیهم اقتدیتم اهتدیتم. رواه رزین.[۱]

**ترجمہ:** میرے صحابہ ستاروں کے مانند ہیں ان میں سے جس کی اقتدا کرو گے ہدایت پا جاؤ گے۔

**نوٹ:** صحابہ کرام کے درمیان احادیث رسول کے بارے میں جو اختلافات تھے وہ حکم نسخ نہ پہنچنے کے سبب تھے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کوئی حکم شرعی کسی متعیّنہ مدت تک کے لیے ہوتا پھر مدت ختم ہوتے ہی حضور صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمْ اپنے قول سے نیا حکم صادر فرماتے۔ اس طرح پہلا حکم متروک العمل قرار پاتا اور دوسرا حکم ناسخ یعنی رائج العمل قرار پاتا۔ اب حکم کی خبر کسی صحابی

(۱)- مشکوٰۃ المصابیح، باب مناقب الصحابۃ، ص: ۵۵٤

تک نہ پہنچتی تو وہ حکم سابق پر ہی عمل کرتے رہتے اور بعد کے لوگ بھی ان سے وہی تعلیم حاصل کر لیتے۔اس طرح فارم میں اختلاف ہو جاتا پھر خیر القرون کے علما ہی نے ایسے اصول وضوابط مرتب کیے کہ تقریباً سارا معاملہ ہی حل ہو گیا۔ تاہم کچھ اختلافات باقی رہ گئے تو یہ کسی نفسانیت یا فساد کی وجہ سے نہ تھے بلکہ سارے صحابہ مخلص تھے، اپنی سمجھ اور معلومات کی بنا پر وہ اتباع رسول ہی کو اپنا شعار بنائے ہوئے تھے۔

"یہیں سے مسلمانوں میں ایک ڈی ریلمنٹ (derailment) شروع ہوا، فقہا کو یہ کہنا چاہیے تھا کہ دین میں اگر چہ اسپرٹ ایک ہے، لیکن فارم میں تنوع (diversity) پایا جاتا ہے، اس لیے تم جس صحابی کی روایت پر چاہو عمل کرو۔ البتہ تم کو سب سے زیادہ دھیان اسپرٹ پر دینا چاہیے۔ لیکن فقہا نے یہاں بطور خود یہ اصول وضع کیا کہ فارم کے بارے میں روایتوں میں کوئی ایک ہی روایت درست ہو سکتی ہے اس لیے اس ذہن کے تحت انھوں نے ترجیح کا یہ اصول وضع کیا۔ وہ بحث ومباحثہ کے ذریعے ایک طریقہ کو راجح اور دوسرے طریقہ کو مرجوح قرار دینے لگے۔ ترجیح کا اصول سب کو ایک رائے پر جمع نہیں کر سکتا تھا، کیوں کہ امام شافعی کے الفاظ میں ساری بحثوں کے باوجود فریق ثانی کے حق میں یہ احتمال باقی رہتا تھا کہ شاید اس کی رائے درست ہو۔" (الرسالہ اگست ۲۰۱۵ء ص: ۱۶، ۱۵)

## اصول جرح و تعدیل کی ضرورت کیوں پیش آئی؟

وحید الدین خاں صاحب کا اعتراض یہ ہے کہ "اس زمانے کے فقہا و محدثین نے بطور خود یہ اصول مرتب کیے کہ فارم (فروعی مسائل) کے بارے میں مختلف روایتوں میں سے کوئی ایک ہی روایت درست ہو سکتی ہے۔ اس لیے اس ذہن کے تحت ان فقہا نے ترجیح کا اصول وضع کیا۔"

یقیناً حق یہی ہے کہ جو روایات آپس میں متصادم اور متضاد ہیں ان میں سے کوئی ایک ہی راجح ہو گی اور دوسری مرجوح، یا یہ کہ ان میں سے ایک ناسخ اور دوسری منسوخ۔ آپس میں متضاد احکام و مسائل پر مشتمل روایت کی متعدّد مثالیں مقدمۂ اولیٰ میں گزر چکیں۔ ایک

واضح مثال یہاں بھی پیش کی جاتی ہے:

عن ابن عباس قال: قال رسول الله ﷺ: من أتیٰ بهيمة فاقتلوه. رواه الترمذي و أبو داود و ابن ماجة. (مشکوۃ المصابیح، کتاب الحدود، ص: ٣١٢)

**ترجمہ:** حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو شخص چوپایے سے وطی کرے تو اسے قتل کردو۔

اور دوسری روایت: وعنه أنه قال: من أتیٰ بهيمة فلا حد عليه. رواه الترمذي و أبو داود.[1]

یعنی حضرت ابن عباس ہی سے مروی ہے کہتے ہیں کہ جو چوپایے سے وطی کرے اس پر حد نہیں یعنی اسے سزا میں قتل نہیں کیا جائے گا۔

اب بتائیں یہ دونوں حدیثیں آپس میں ایک دوسرے کے مخالف ہیں اور دونوں حضرت ابن عباس ہی سے منقول ہیں تو کیا کوئی شخص دونوں باتیں ایک ہی وقت میں کہہ سکتا ہے؟ ہرگز ایسا نہیں کہہ سکتا، بلکہ معاملہ یہ ہوگا کہ ایک قول پہلے کا ہوگا اور دوسرا قول کچھ بعد کا ہوگا، تو اگر معاملہ ایسا ہو تو پہلے قول منسوخ یعنی متروک العمل ہوگا اور دوسرا قول ناسخ یعنی اب اس دوسرے قول پر عمل کیا جائے گا۔

اور ایسا بھی ممکن ہے کہ کہنے والے نے تو ایک ہی بات کہی لیکن سننے والوں نے جب وہ بات دوسروں تک پہنچائی تو ان میں سے ایک نے غلطی کردی اور دوسرے نے کوئی غلطی نہیں کی، خواہ غلطی کرنے والے نے جان بوجھ کر غلطی کی ہو یا بھول جانے کی وجہ سے غلطی ہوگئی ہو بہرحال اس کی بات غلط ہی ہوگی۔ تو اب دوسرے لوگ جن تک یہ متضاد باتیں پہنچیں وہ تو ضرور غور کریں گے کہ ان میں کون صحیح کہہ رہا ہے اور کون غلط۔ اب اگر ان پہنچانے والوں میں سے ایک ایسا ہو کہ وہ جھوٹ بولتا ہو اور فاسق و فاجر ہو اور دوسرا ایمان دار اور متقی و پرہیزگار ہو تو لوگ یقیناً متقی کی بات مانیں گے نہ کہ فاسق کی۔

یوں ہی اگر ان میں سے ایک ذہین و فطین اور اعلیٰ درجہ کی قوت حافظہ رکھتا ہو اور دوسرا نسیان کا مریض ہو تو لوگ یقیناً اس کی بات مانیں گے جس کا حافظہ اچھا ہو۔

(١)- مشکوۃ المصابیح، کتاب الحدود، ص: ٣١٣

اور اگر دونوں اعلیٰ درجے کے حافظے کے مالک بھی ہوں اور متقی و پرہیزگار بھی لیکن ان میں سے ایک کی تائید دیگر سننے والے بھی کر رہے ہوں اور دوسرا اپنے قول میں تنہا ہو تو یقیناً لوگ اس کی بات مانیں گے جس کی تائید دوسرے سننے والے بھی کر رہے ہوں۔

مذکورہ بالا صورتوں میں ایک کی بات مقبول ہو رہی ہے تو دوسرے کی نہیں۔ بس اسی کو جرح و تعدیل اور راجح و مرجوح قرار دینا کہتے ہیں۔ تو اب آپ ہی بتائیں اگر ایسا نہ کیا جائے بلکہ عوام پر چھوڑ دیا جائے کہ یہ دونوں روایتیں آپس میں متضاد ہیں جس پر چاہو عمل کر لو تو اللہ ہی جانے کس قدر فتنہ بپا ہو گا۔

آئیے اب ہم بتاتے ہیں کہ اصول راجح و مرجوح کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ خلیفۂ راشد حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد جب اختلافات واقع ہوئے تو منافقین اور زنادقہ (بے دینوں) نے حدیثیں گڑھنی شروع کر دیں۔ مشہور محدث حماد بن زید فرماتے ہیں: وضعت الزنادقة علی رسول اللہ ﷺ أربعة عشر ألف حديث. یعنی زنادقہ نے رسول اللہ ﷺ پر چودہ ہزار حدیثیں گڑھیں۔[1]

عبد الکریم بن ابی العوجاء جسے خلیفہ مہدی کے دور حکومت میں وضع حدیث کے جرم میں قتل کیا گیا اور سولی دی گئی۔ اس کے بارے میں معروف محدث ابن عدی فرماتے ہیں کہ جب اس کی گردن مارنے کے لیے اسے گرفتار کیا گیا تو اس نے کہا: وضعت فيكم أربعة آلاف حديث أحرم فيها الحلال وأحلل فيها الحرام. (مرجع سابق)

ترجمہ: میں نے تم میں چار ہزار حدیثیں گڑھیں ہیں جن میں حلال کو حرام اور حرام کو حلال کیا ہے۔

خلیفہ ہارون رشید کے دربار خلافت میں ایک زندیق کو لایا گیا جس کی گردن مارنے کا حکم صادر ہوا، تو زندیق نے خلیفہ سے پوچھا: تم مجھے قتل کیوں کرو گے؟ خلیفہ نے جواب دیا: بندگان خدا کو تمھارے شر سے نجات دینے کے لیے۔ زندیق نے کہا: ان ایک ہزار حدیث سے تم کہاں راحت پا سکو گے جن کو میں نے رسول اللہ ﷺ پر وضع کیا ہے؟ ان میں کوئی ایسا حرف نہیں جو رسول خدا ﷺ کی زبان سے صادر ہو۔ خلیفہ نے جواب دیا: فأين أنت

(۱)- تدریب الراوی ص: ۲۵۲

يا عدوالله من إسحاق الفزاری وعبدالله بن المبارك ينخلانها فيخرجانها حرفاً حرفاً[1]

**ترجمہ:** اے اللہ کے دشمن! تو ابو اسحاق فزاری اور عبداللہ بن مبارک سے کہاں غافل ہے یہ حضرات تیری گڑھی ہوئی حدیثوں کو بھوسی کی طرح چال کر ایک ایک حرف الگ کردیں گے۔

میرے خیال سے اصول جرح وتعدیل کی ضرورت واہمیت کے تعلق سے مزید لکھنے کی حاجت نہیں۔ آپ نے مذکورہ بالا تحریر سے جان ہی لیا ہوگا۔

اگلا اقتباس ملاحظہ کریں:

”دین میں اسپرٹ کے بجائے فارم کو اہمیت دینے کا یہ فقہی طریقہ بعد کے لوگوں کے لیے ایک رجحان ساز (trendsetter) واقعہ بن گیا۔ اس کے بعد دینی موضوعات پر جو کتابیں لکھی گئیں وہ تقریباً سب کی سب اسی نہج پر لکھی گئیں۔ یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ دین بیضا کا دین غیر بیضا بن جانے کا اصل سبب یہی ہے۔

اگر آپ فقہی کتابوں کا مطالعہ کریں تو آپ پائیں گے کہ فقہ میں بظاہر اسلام کی مختلف تعلیمات زیر بحث آئی ہیں، لیکن عملاً تمام فقہی بحثیں ان تمام تعلیمات کے فارم پر ہوئی ہیں۔ فقہ کا پیٹرن اصولی بنیاد پر نہیں بنا، بلکہ حالات کے زیر اثر (situational faetor) بنا ہے۔ آپ قرآن کو پڑھیں تو معلوم ہوگا کہ قرآن میں سارا زور اسلام کی اسپرٹ پر دیا گیا ہے لیکن فقہ میں ایک شفٹ آف ایمفیسس (shift of emphasis) کا واقعہ پیش آیا اور سارا زور اسپرٹ کے بجائے فارم پر دیا جانے لگا۔ (الرسالہ اگست، ۲۰۱۵ء ص:۱۶)

## قرآنی پیٹرن کے بجائے فقہی پیٹرن

اس کے بعد مزید یہ ہوا کہ فقہ کا یہ اسلوب عملاً اہلِ علم کے درمیان عام ہوگیا۔ بعد کے اہل علم نے اسی پیٹرن کو معیاری پیٹرن کی حیثیت سے اختیا کرلیا وہ اسی انداز میں سوچنے لگے اور اسی انداز پر کتابیں لکھنے لگے۔ یہ فقہی پیٹرن اتنا

(۱) - تاریخ الخلفا، ص:۲۹۳

زیادہ عام ہوا کہ بعد کے زمانے میں لکھی جانے والی کتابوں میں شاید کوئی بھی کتاب اس سے مستثنیٰ نہیں۔" (الرسالہ اگست ،۲۰۱۵ء ص:۱۶)

مذکورہ بالا اقتباس میں جو کچھ ہے ان سب کی حقیقت آپ پر واضح ہو چکی کہ کتنی صداقت ہے اور کتنا فسانہ تاہم دو چیزوں کے بارے میں ہمیں گفتگو کرنی ہے:

(۱)- مولانا موصوف بار بار فارم کی بات کر رہے ہیں کہ فقہا نے اسپرٹ کے بجائے فارم کو اہمیت دی۔ حالاں کہ انھیں جاننا چاہیے کہ فارم اور اسپرٹ آپس میں دونوں لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں کہ جب تک فارم درست نہ ہو اس وقت تک نہ تو اسپرٹ کا حصول ہو سکتا ہے اور نہ اسپرٹ کی لذت مل سکتی ہے۔ اس کو سمجھنے کے لیے ایک عام مثال علمِ ریاضی (Mathematics) کے مسائل ہیں کہ اگر ایک عدد کی بھی غلطی رہ گئی تو پھر نتیجہ ہرگز نہیں نکل سکتا۔

حالاں کہ مقصود صحیح نتیجے تک پہنچنا ہی ہے نہ کہ میتھ کی تھیوری اور پریکٹیکل۔ یا درمیان کا جوڑنا گھٹانا، لیکن چوں کہ درست نتیجے کے لیے درمیانی عمل کی درستگی شرط ہے لہٰذا جب تک حصول نتیجہ کی ہر چیز صحیح جگہ پر واقع نہ ہو تو پھر درست نتیجے کی امید محض لغو ہو گی۔

مزید وضاحت کے لیے ایک عام فہم مثال ملاحظہ کریں:

جب کسی شخص کو کسی پرندے کا شکار کرنا ہو یا کسی منزل مقصود تک پہنچنا ہو تو اسے اپنے ہدف پر تیر چلانے کے لیے نشانے کی درستگی اور کمان کا چلہ چڑھانے میں تمام کوتاہیوں سے اجتناب کی ضرورت ہوتی ہے ورنہ پرندہ تو دور کی بات تیر ضائع ہونے کے ساتھ ساتھ کسی اور کی جان بھی جا سکتی ہے، یوں ہی منزل مقصود تک پہنچنے کے لیے مکمل راستے سے واقف اور آشنا ہونا ضروری ہے ورنہ مسافر ہرگز منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتا۔

بس یوں ہی فارم اور اسپرٹ کا معاملہ ہے کہ جب تک فارم صحیح نہ ہو اسپرٹ کا حصول محال۔ اب کھلے لفظوں میں سمجھیں کہ علم فقہ تھیوری (Theory) اور اس پر بندوں کا عمل پریکٹیکل (Practical) اور نتیجہ (Result) اسپرٹ یعنی قرب اور رضائے الٰہی ہے۔

اور وحید الدین خاں صاحب کا یہ رونا کہ فقہا صرف فارم ہی سے بحث کرتے ہیں تو

انھیں جاننا چاہیے کہ علم فقہ کا موضوع (Topic) ہی فارم یعنی افعال مکلفین کی شرعی جانچ پڑتال ہے لہٰذا فقہا کا کام یہی ہے کہ وہ منہیات شرعیہ اور اوامر دینیہ کی نشان دہی کریں تاکہ بندہ فارم (شریعت) پر عمل کرکے اسپرٹ (قرب الٰہی) کی اعلیٰ منزل پر فائز ہوسکے۔ کیوں کہ جب تک بندہ نماز، روزہ، حج و زکوٰۃ وغیرہ عبادتوں کو صحیح طور پر ادا نہ کرے اسے اسپرٹ کی لذت حاصل نہیں ہوسکتی۔

**(۲)**- یہ کہنا کہ فقہ کا پیٹرن اصولی بنیاد پر نہیں بالکل غلط اور افترا ہے جیساکہ آپ نے اس سے پہلے ملاحظہ کیا کہ علم فقہ کی بنیاد ہی قرآن و حدیث ہیں اور زمانہ جوں جوں آگے بڑھتا گیا اور امت مسلمہ کو نئے مسائل در پیش ہوتے گئے تو فقہاے کرام نے ان کا شرعی حل پیش فرمایا اور سب سے پہلے ہر ایک مسئلے کا حل قرآن میں پھر نہ ملنے پر حدیث میں تلاش کیا گیا اور جب دونوں میں تفصیلی اور واضح بیان نہ مل سکا تو انھیں کی روشنی میں فقہا نے قیاس و اجتہاد سے کام لیا جیساکہ صحابیِ رسول حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی حدیث میں تفصیل گزر چکی۔ اور صحابۂ کرام کی زندگی میں اجتہادی مسائل کی ایک دو نہیں ہزاروں مثالیں موجود ہیں۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے متعلق تاریخ میں ملتا ہے کہ انھوں نے کئی ہزار نئے اور غیر منصوص مسائل کا استخراج و استنباط فرمایا بلکہ تفریع و استنباط یعنی اصول فقہ کی بنیاد بھی آپ ہی نے رکھی، ان کے علاوہ بقیہ خلفا اور عبد اللہ بن مسعود، زید بن ثابت، معاذ بن جبل، ابو موسیٰ اشعری، عبد اللہ ابن عباس، عبد اللہ بن عمر اور ابو درداء انصاری رضی اللہ عنہم اجمعین بھی اس باب میں انتہائی مشہور و معروف تھے۔

نمونے کے طور پر ایک مسئلہ ملاحظہ کریں:

مؤطا امام مالک میں ہے: عن ثور بن زيد الديلمي أن عمر بن الخطاب استشار في الخمر يشربها الرجل، فقال علي بن أبي طالب نرىٰ أن تجلده ثمانين فإنه إذا شرب سكر وإذا سكر هَذَا وإذا هَذا افترى -أو كما قال- فجلد عمر ثمانين.[1]

حضرت امام مالک رضی اللہ عنہ نے ثور بن زید دیلمی سے روایت کی کہ حضرت عمر فاروق

(۱)- مؤطا إمام مالك ص: ۳۵۷، باب ما جاء في حد الخمر من كتاب الأشربة.

رضی اللہ عنہ نے خمر (شراب) کے متعلق صحابۂ کرام سے مشورہ کیا کہ جب کوئی شخص شراب پی لے تو اس کے ساتھ کیسا برتاؤ کیا جائے تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم نے فرمایا کہ میری رائے یہ ہے کہ اسے اسی کوڑے مارے جائیں کیوں کہ جب وہ شراب پیے گا تو نشہ ہوگا اور نشہ ہوگا تو وہ بے ہودہ بکے گا تو افترا کرے گا۔(تہمت لگائے گا) اور افترا کی سزا ۸۰/ کوڑے ہیں۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے ۸۰/ کوڑے لگانے کا حکم نافذ کیا۔

بس اسی طریقے کو فقہاے کرام نے نوپید مسائل میں اپنایا، تو جسے صحابۂ کرام کا یہ طریقہ پسند نہ ہو وہ اپنے دین و مذہب کی خیر منائے۔ واللہ الموفق لکل خیر و الدافع لکل الضیر.

آگے وحید الدین خاں صاحب فقہی پیٹرن پر لکھی گئی کتابوں کی مثال دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مثلاً ابن تیمیہ (وفات:۱۳۲۷ء) کی کتاب "الصارم المسلول علی شاتم الرسول" اسی نہج کی ایک کتاب ہے۔ اس کتاب میں ابن تیمیہ نے شاتم رسول کے لیے قتل کی سزا بتائی ہے۔ صرف اس لیے کہ فقہا نے بعد کے زمانے میں یہ حکم وضع کیا کہ شاتم رسول کو بطور سزا قتل کیا جائے گا۔(یقتل حدًا) حالاں کی قرآن میں اس حکم کی کوئی اصل موجود نہیں۔ ابن تیمیہ اگر کتب فقہ سے اوپر اٹھ کر اس موضوع پر قرآن کی پیٹرن کے مطابق اس مسئلے پر غور کرتے تو وہ لکھتے کہ شاتم سول کی حیثیت ایک مدعوکی ہے، شاتم کو دعوت دینا ہے نہ کہ قتل کرنا۔ شاتم رسول بظاہر دشمن نظر آتا ہے تب بھی اپنی فطرت کے اعتبار سے وہ ایک انسان ہے۔ اگر اس کے سامنے اسلام کا دین حکیمانہ انداز میں پیش کیا جائے تو عین ممکن ہے کہ وہ اسلام کی حقانیت کا اعتراف کرے اور اس کی دشمنی دوستی میں تبدیل ہو جائے۔" (الرسالہ اگست ص:۱۶،۱۷)

واضح رہے کہ ابن تیمیہ کے عقائد و نظریات سے صرف نظر کرتے ہوئے ہم صرف ابن تیمیہ کے موقف کی تائید پر گفتگو کریں گے کیوں کہ یہی موقف و نظریہ اہل سنت و جماعت کا ہے اور یہی حق و صواب بھی۔

**مذکورہ بالا اقتباس کا ماحصل:**

☆ابن تیمیہ نے شاتم رسول کی سزا فقہا کے قول کے مطابق قتل بتائی ہے حالاں کہ قرآن میں اس حکم کی کوئی اصل موجود نہیں۔

☆ابن تیمیہ اگر اس مسئلے پر قرآن کی اسپرٹ کے مطابق غور کرتے تو قتل کا حکم نہ دیتے بلکہ یہ لکھتے کہ شاتم ایک مدعو ہے اسے حکیمانہ انداز میں دعوت دینی چاہیے ہو سکتا ہے اسلام کی حقانیت کا اعتراف کر لے۔

جہاں تک رہی بات دین کی دعوت حکیمانہ انداز میں پیش کرنے کی تو اس میں شاتم رسول ہی کی کیا خصوصیت اس معاملے میں تو کفار و مشرکین سبھی برابر ہیں، لیکن پھر قرآن مجید میں یہ کیوں کہا گیا: فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوهُمْ (جہاں پاؤ مشرکوں کو قتل کر ڈالو) يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ط (اے نبی! کفار و منافقین سے جہاد کرو اور ان پر سختی کرو)

یقیناً دین کی دعوت حکیمانہ انداز میں پیش کرنی چاہیے لیکن یہ اول امر ہے، پس نہ ماننے کی صورت میں جہاد و قتال بھی ضروری ہے یعنی اوّلاً اسے (منکر اسلام کو) دعوت دی جائے پھر آخراً نہ ماننے کی صورت میں قتل کیا جائے گا۔ جہاد فی سبیل اللہ میں بھی یہی ہوتا ہے کہ یا تو اسلام قبول کرو یا جزیہ دے کر غلامی اختیار کرو یا پھر جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ کیوں کہ یہ کائنات اللہ کی ہے اس میں اسی کا حکم چلے گا۔ گھر کسی کا اور نظام کسی اور کا یہ عقل کے بھی خلاف ہے۔

یوں ہی گستاخ بھی مستحق قتل ہے لیکن اسے بھی موقع و حکمت کے لحاظ سے مہلت و دعوت دی جاسکتی ہے۔ اور یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ کب کیسی حکمت عملی درکار ہے یہ تو مسلمان کا دل خود ہی حقیقت و حالت کے اعتبار سے فیصلہ کر سکتا ہے۔ بہر حال یہ تو رہی بات بلاد اسلامیہ کی لیکن وہ ممالک جن میں اسلامی حکومت نہیں، غیر اسلامی حکومت یا سیکولرزم ہے وہاں حتی المقدور گستاخ پر سختی اور اس کی مخالفت میں آواز بلند کی جائے گی اور اس کا بائیکاٹ کیا جائے گا۔ کسی بھی حکومت کے باغی کے ساتھ آج بھی یہی کیا جاتا ہے، اور کوئی اعتراض نہیں کرتا۔

اب دیکھیں قرآن مقدس نے شاتم رسول (یعنی حضور ﷺ کو گالی دینے والے) کی کیا سزا بتائی ہے۔

پہلے تو یہ جاننا چاہیے کہ شاتم کی دو قسمیں ہیں: (۱) وہ گستاخ جو اعلانیہ کافر و مشرک ہو یعنی جو مسلمان نہ کہلائے۔ (۲) وہ گستاخ جو اپنے آپ کو مسلمان بتائے اور سرکار ﷺ کو گالیاں دے اور گستاخی کرے۔

پہلی قسم کا شاتم تو حکم قرآنی قطعی کے مطابق " فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ " کے تحت داخل ہونے کے سبب قتل کا مستحق ہے۔

نیز سورۂ نساء آیت نمبر ۸۹ ر میں کفار کے بارے میں حکم ہوا کہ ان کفار کو چاہیے کہ وہ ایمان لاکر ہجرت کریں پھر ایمان و ہجرت سے گریز کرنے کی صورت میں مسلمانوں کو ان کے متعلق حکم دیا گیا: "فَاِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْهُمْ وَ اقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ ۪ وَ لَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَّ لَا نَصِيْرًا ۙ﴿۸۹﴾"

یعنی اگر وہ ایمان و ہجرت سے منہ پھیریں اور اپنی حالت کفر پر قائم رہیں تو انھیں پکڑو اور جہاں پاؤ قتل کر ڈالو اور ان میں سے کسی کو نہ اپنا دوست بناؤ اور نہ معین و مددگار۔

بہر حال یہ تو حکم ہوا اس گستاخ کافر و مشرک کا جو کبھی بھی اسلام نہ لایا ہو اور ہمیشہ سے کافر ہی رہا ہو۔

اور دوسری قسم کا شاتم و گستاخ تو وہ بھی سرکار ﷺ کی گستاخی کر کے حکم قطعی " لَا تَعْتَذِرُوْا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ ؕ" کے مطابق کافر و مرتد ہو گیا۔ اس مقام پر آیت مذکورہ کا شان نزول مزید وضاحت کے لیے قابل ذکر ہے۔ ملاحظہ ہو:

## شان نزول:

غزوۂ تبوک میں جاتے ہوئے منافقین کی تین جماعتوں میں سے دو جماعتوں نے رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی نسبت تمسخراً (مذاق کے طور پر) کہا کہ ان کا (یعنی حضور ﷺ کا) خیال ہے کہ یہ روم پر غالب آجائیں گے، کتنا بعید خیال ہے۔ اور ان میں سے تیسرا (گروہ) کچھ نہ بولتا تھا مگر ان کی باتوں کو سن کر ہنستا اور ٹھٹھا کیا کرتا تھا۔ حضور ﷺ نے انھیں بلایا اور فرمایا: کیا تم ایسا کہہ رہے تھے؟ انھوں نے کہا کہ ہم تو بس راستہ کاٹنے کے لیے

ہنسی مذاق کے طور پر دل لگی کی باتیں کررہے تھے۔ اس پر یہ آیات کریمہ نازل ہوئیں:

يَحْذَرُ الْمُنٰفِقُوْنَ اَنْ تُنَزَّلَ عَلَيْهِمْ سُوْرَةٌ تُنَبِّئُهُمْ بِمَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ ؕ قُلِ اسْتَهْزِءُوْا ۚ اِنَّ اللّٰهَ مُخْرِجٌ مَّا تَحْذَرُوْنَ ﴿۶۴﴾ وَ لَئِنْ سَاَلْتَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّمَا كُنَّا نَخُوْضُ وَ نَلْعَبُ ؕ قُلْ اَبِاللّٰهِ وَ اٰيٰتِهٖ وَ رَسُوْلِهٖ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۶۵﴾ لَا تَعْتَذِرُوْا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ ؕ(۱)

**ترجمہ:** منافق ڈرتے ہیں کہ ان (مسلمانوں) پر کوئی ایسی سورہ اترے جوان (منافقوں) کے دلوں کی چھپی ظاہر کردے۔ تم فرمادو: ہنسے جاؤ، اللہ کو ضرور ظاہر کرنا ہے جس کا تمھیں ڈر ہے۔ اور اے محبوب! اگر تم ان سے پوچھو تو کہیں گے کہ ہم تو یوں ہی ہنسی کھیل میں تھے، تم فرماؤ کیا اللہ اور اس کی آیتوں اور اس کے رسول سے ہنستے ہو؟ بہانے نہ بناؤ تم کافر ہو چکے مسلمان ہونے کے بعد۔

اور ایسا کیوں نہ ہو کہ اس شاتم و گستاخ نے اس ذات گرامی کی شان میں ہرزہ سرائی اور ہفوات بکے جو رب العالمین کے محبوب اور پوری انسانیت کے سردار ہیں جیسا کہ حدیث پاک میں وارد ہوا: ”أنا سید ولد آدم“ یعنی میں اولادِ آدم کا سردار ہوں۔ اور یہ وہ ذات گرامی ہے جن کی محبت جانِ ایمان کہ بغیر ان سے محبت کیے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جیسا کہ حدیث پاک میں وارد ہوا: ”قال رسول الله ﷺ: لا يؤمن أحدكم حتىٰ أكون أحب إليه من والده و ولده والناس أجمعين.“(۲)

**ترجمہ:** رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم میں سے کوئی اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک میں اس کے نزدیک اس کے باپ، بیٹے اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔

اور ایک روایت اس طرح ہے: ”عن عبد الله بن هشام قال: كنا مع النبي ﷺ وهو آخذ بيد عمر بن الخطاب فقال له عمر: يارسول الله! لأنت أحب إليّ من كل شيء إلا نفسي، فقال النبي ﷺ لا، والذي نفسي بيده حتىٰ أكون

(۱)- التوبة: ٦٤، ٦٥

(۲)-صحيح البخاری، كتاب الإيمان، باب حب الرسول من الإيمان، ج: ۱ ص: ۷

أحب إليك من نفسك، فقال له عمر: فإنه الآن والله لأنت أحب إليّ من نفسي، فقال النبي ﷺ الآن يا عمر."[1]

یعنی حضرت عبد اللہ بن ہشام سے مروی کہتے ہیں کہ ہم نبی اکرم ﷺ کے ساتھ تھے اور آپ ﷺ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھے تو حضرت عمر نے عرض کیا: یارسول اللہ! (علیک السلام) آپ میرے نزدیک میری جان کے علاوہ تمام چیزوں سے زیادہ محبوب ہیں، تو آپ نے ارشاد فرمایا: نہیں عمر، تم اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ میں تمھارے نزدیک تمھاری جان سے بھی زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں، تو حضرت عمر نے عرض کیا: خدا کی قسم! اب آپ میرے نزدیک میری جان سے بھی زیادہ محبوب ہیں، تو سرکار علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: ہاں عمر! تمھارا ایمان اب کامل ہوا۔

بہر حال جب کسی کو سرکار علیہ السلام سے اس طرح محبت ہوگی تو یقیناً وہ آپ کی شان میں نہ خود گستاخی کر سکتا ہے اور نہ کسی گستاخ کی گستاخی برداشت کر سکتا ہے، لیکن جو خود اس بارگاہ کا گستاخ ہو اور سب وشتم سے پیش آتا ہو تو وہ ہرگز مسلمان نہیں ہو سکتا بلکہ وہ قرآن وحدیث کی رو سے کافر ومرتد ہے۔

لہٰذا دوسری قسم کا شاتم بھی مندرجہ بالا آیت کا مصداق اور قتل کا سزاوار ہے کہ جو اپنا دین بدل دے اسے قتل کردو۔ (جامع الترمذی)

اب حدیث پاک میں دیکھیں کہ **شاتم کی سزا** کیا ہے:

حدثنا قتيبة بن سعيد حدثنا سفيان عن عمرو بن دينار عن جابر بن عبد الله رضي الله عنهما أن النبي ﷺ قال: من لكعب بن الأشرف؟ فإنه قد أذى الله ورسوله، قال محمد بن مسلمة أتحب أن أقتله يا رسول الله؟ قال: نعم، قال فأتاه فقال: إن هذا - يعني النبي ﷺ - قد عنانا وسألنا الصدقة قال وأيضًا والله لتملنه قال فإنا قد اتبعناه فنكره أن ندعه حتى ننظر إلى ما يصير أمره قال فلم يزل يكلمه حتى استمكن منه فقتله.[2]

(۱)-صحیح البخاری، کتاب الأیمان والنذور، باب کیف کان یمین النبی ﷺ ج:۲، ص:۹۸۱

(۲)-بخاری شریف، کتاب الجہاد والسیر۔ ص:۴۲۵ مطبوعہ کتب خانہ شیدیہ دہلی۔

**ترجمہ:** حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کعب بن اشرف کو کون قتل کرے گا کیوں کہ اس نے اللہ اور اس کے رسول کو اذیت دی ہے۔ محمد بن مسلمہ نے عرض کی یا رسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وسلم) کیا آپ پسند فرماتے ہیں کہ میں اسے قتل کر دوں؟ فرمایا: ہاں! راوی کہتے ہیں کہ وہ (محمد بن مسلمہ) کعب بن اشرف کے پاس گئے اور کہا: اس شخص یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں اوامر و نواہی کا مکلف بنا دیا ہے اور ہم سے صدقات طلب کرتے ہیں۔ کعب بن اشرف نے کہا: بخدا تم اور زیادہ تنگ پڑ جاؤ گے، محمد بن مسلمہ نے کہا ہم نے اس کی اتباع کی ہے اور اس کو چھوڑنا پسند نہیں کرتے یہاں تک کہ ہم دیکھ لیں کہ ان کا معاملہ کدھر کو جاتا ہے۔ وہ بہت دیر تک اس کے ساتھ محو گفتگو رہے حتی کہ اس پر قادر ہو کر اسے قتل کر دیا۔

## دوسری حدیث:

حدثنا عثمان بن أبي شيبة و عبد الله بن الجراح عن جر ير بن مغيرة عن الشعبي عن علي أن يهودية كانت تشتم النبي صلى الله تعالى عليه وسلم وتقع فيه فخنقها رجل فماتت فأبطل رسول الله صلى الله تعالى عليه وسلم دمها.[1]

**ترجمہ:** شعبی نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم سے روایت کی کہ ایک یہودی عورت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سب و شتم کرتی (یعنی گالیاں دیتی) اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو کرتی۔ ایک شخص نے اس کا گلا گھونٹ دیا یہاں تک کہ وہ مر گئی۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے خون کو باطل قرار دے دیا یعنی اس کی دیت کو ساقط کر دیا۔

## تیسری حدیث:

حدثنا عباد بن موسىٰ الختلي نا إسماعيل بن جعفر المدني عن إسرائيل عن عثمان الشحام عن عكرمة قال نا ابن عباس أن أعمىٰ كان له أم ولد تشتم النبي صلى الله تعالى عليه وسلم فلما كانت ذات ليلة جعلت تقع في النبي صلى الله تعالى عليه وسلم وتشتمه فأخذ المغول فوضعه في بطنها واتكأ عليها فقتلها فوضع بين رجليها طفل فلطخت ما هناك بالدم فلما أصبح ذكر ذلك للنبي صلى الله تعالى عليه وسلم فجمع الناس فقال:

(۱)–سنن ابی داؤد کتاب الحدود، الجزء الثانی، ص: ۶۰۰

الله رجلا فعل ما فعل، لي عليه حق إلا قام فقام الأعمیٰ يتخطى الناس وهو يتزلزل حتى قعد بين يدي النبي ﷺ فقال يا رسول الله أنا صاحبها كانت تشتمك وتقع فيك فأنهاها فلا تنتهي وأزجرها فلا تنزجر ولي منها ابنان مثل اللؤلؤتين وكانت بي رفيقة فلما كانت البارحة جعلت تشتمك وتقع فيك فأخذت المغول فوضعته في بطنها واتكأت عليها حتیٰ قتلتها فقال النبي ﷺ ألا أشهدوا أن دمها هدر.[1]

یعنی حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ ایک نابینا صحابی کی ایک ام ولد (ایسی باندی جس سے آقا کا بچہ پیدا ہوا ہو) تھی جو نبی کریم ﷺ کو گالیاں دیتی اور آپ کی بدگوئی کرتی تھی، آقا (نابینا صحابی) منع کرتا مگر باز نہ آتی، ڈانٹ ڈپٹ کرتا تب بھی نہ رکتی۔ ایک رات اس نے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی بدگوئی شروع کی اور گالیاں دیتی رہی۔ پس نابینا صحابی رضی اللہ عنہ نے خنجر لے کر اس کے پیٹ پر رکھا اور دباو ڈال کر اسے قتل کردیا۔ چناں چہ اس کی ٹانگوں کے درمیان سے بچہ بھی برآمد ہوا جس سے وہ خون میں لت پت ہوگئی۔ صبح کے وقت نبی کریم ﷺ سے اس بات کا ذکر ہوا تو آپ ﷺ نے لوگوں کو جمع کر کے فرمایا: میں ایسا کرنے والے کو اللہ کی قسم دیتا ہوں اور اپنے حق کی جو میرا اس پر ہے کہ وہ کھڑا ہو جائے۔ پس نابینا صحابی رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے، لوگوں کو پھاندتے اور لرزتے آگے بڑھے یہاں تک کہ نبی کریم ﷺ کے سامنے جا بیٹھے۔ عرض کی یا رسول اللہ! (علیک الصلوٰۃ والسلام) میں اس کا مالک تھا، وہ آپ (علیک السلام) کو گالیاں دیتی اور ہجو کیا کرتی تھی۔ میں منع کرتا تو باز نہ آتی، دانٹ ڈپٹ کرتا تب بھی نہ رکتی۔ میرے اس سے دو بیٹے موتیوں کی طرح ہیں اور وہ میری غمخوار تھی۔ گزشتہ رات جب وہ آپ (صلی اللہ تعالیٰ علیک وسلم) کو سب وشتم کرنے لگی اور آپ کی ہجو کی تو میں نے خنجر لے کر اس کے پیٹ پر رکھ دیا اور دباو ڈال کر اسے قتل کردیا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: لوگو! گواہ رہنا کہ اس کا خون رائیگاں (بے کار) گیا۔

اب اگر شاتم رسول (حضور ﷺ کو گالی دینے والے) کی سزا قتل نہ ہوتی تو ہرگز اس شاتمہ کے خون کو سراپا عدل اور انصاف کے پیکر، سلطان بحر و بر، رسول جن و بشر

(۱)–سنن ابی داؤد کتاب الحدود، الجزء الثانی، ص:۵۹۹

صلوات اللہ علیہ الیٰ یوم المحشر ہدر ولغو (رائیگاں وبے کار) قرار نہ دیتے بلکہ اس کے بدلے میں اس نابینا صحابی رضی اللہ عنہ کو بھی بطور قصاص قتل کیا جاتا یا اس کی دِیت (خوں بہا، قتل کا جرمانہ) مقرر ہوتا۔ یوں ہی کعب بن اشرف کے قتل کا حکم نہ دیتے اور نہ ہی اسے پسند فرماتے۔

## چوتھی حدیث:

عن ابن عباس رضي الله عنهما أن رجلا من المشركين شتم النبي صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فقال النبي صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم: من يكفيني عدوي؟ فقال الزبير: أنا، فبارزه فقتله فأعطاه رسول الله صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سلبه. (رواه عبد الرزاق وأبو نعيم)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ایک مشرک شخص نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو گالیاں دیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کون میرے دشمن سے بدلہ لے گا؟ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا حضور میں، پھر میدان میں نکل کر اس کا مقابلہ کیا اور اسے قتل کر دیا تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مقتول کا سَلَب (مقتول کے ساتھ کا مال) حضرت زبیر کو عطا فرمایا۔ (اس حدیث کو امام عبدالرزاق نے اپنی کتاب ''مصنف عبدالرزاق'' میں روایت کیا ہے اور ابو نعیم نے اپنی کتاب ''حلیۃ الاولیاء'' میں)

اگر گستاخ کی سزا قتل نہ ہوتی تو سرکار علیہ السلام نہ تو قتل کی اجازت دیتے اور نہ ہی قتل کرنے پر حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو انعام دیتے۔

## پانچویں حدیث:

عن أنس ابن مالك رضي الله عنه أن رسول الله صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم دخل عام الفتح وعلیٰ رأسه المغفر فلما نزعه جاء رجل فقال: إن ابن خطل متعلق بأستار الكعبة فقال: اقتلوه.(۱)

**ترجمہ:** حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ فتح مکہ کے سال رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے تو آپ کے سر مبارک پر لوہے کا خود تھا جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے

(۱)- بخاری شریف أبواب العمرة باب دخول الحرم ومكة بغير إحرام ج:۱، ص:۲۴۹ فاروقیہ بکڈپو دہلی۔

اتارا تو ایک شخص نے آکر عرض کیا: (یارسول اللہ! آپ کا گستاخ) ابن خطل کعبہ معظمہ کے پردوں سے لپٹا ہوا ہے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: اسے (وہیں) قتل کردو۔

اب بتائیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن خطل کو اس مقام پر بھی چھوڑنے کی اجازت نہیں دی جہاں غیر موذی جانور کو مارنے اور وہاں کی گھاس اکھاڑنے کی ممانعت ہے۔

## چھٹی حدیث: مرتد کی سزا:

حدثنا أحمد ابن عبدة الضبي ثنا عبد الوهاب الثقفي ثنا أيوب عن عكرمة أن عليا حرق قوما ارتدوا عن الإسلام فبلغ ذلك ابن عباس فقال لو كنت أنا لقتلتهم بقول رسول الله ﷺ قال رسول الله ﷺ: من بدل دينه فاقتلوه ولم أكن لأحرقهم لأن رسول الله ﷺ قال: لا تعذبوا بعذاب الله فبلغ ذلك عليا فقال: صدق ابن عباس.[1]

**ترجمہ:** حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسلام سے پھر جانے والی ایک قوم کو جلا دیا تو جب یہ بات حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما تک پہنچی تو انھوں نے کہا کہ اگر میں ہوتا تو انھیں (یعنی مرتدوں کو) قتل کرڈالتا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کی بنیاد پر کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جو اپنا دین بدلے تو اسے قتل کردو۔'' انھیں جلاتا نہیں کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے عذاب دینے کی طرح عذاب (سزا) نہ دو، تو جب یہ بات حضرت علی رضی اللہ عنہ تک پہنچی تو آپ نے فرمایا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے سچ کہا۔

اس حدیث کو امام بخاری نے بھی اپنی کتاب ''صحیح البخاری'' (جلد اول، باب لا یعذب بعذاب اللہ ص: ۴۲۳۔ مطبع فاروقیہ بکڈپو) میں نقل فرمایا ہے اور امام ابوداؤد نے اپنی کتاب ''سنن ابی داؤد'' (ج:۲، کتاب الحدود باب الحکم فی من ارتد. ص:۵۹۸۔ مطبع المکتبۃ الأشرفیہ بدیو بند) میں بھی ذکر کیا ہے، یونہی نسائی کتاب تحریم الدم، باب الحکم فی المرتد، اور ابن ماجہ کتاب الحدود باب المرتد عن دینہ اور مسند احمد بن حنبل اور صحیح ابن حبان وغیرہ میں بھی یہ حدیث مذکور ہے۔

قارئین! اس باب میں احادیث کثیر تعداد میں موجود ہیں مگر طوالت کے خوف سے

(۱)- جامع الترمذی ج:۱، أبواب الحدود باب ماجاء في المرتد ص:۱۷۶

ہم انھیں پر اکتفا کرتے ہیں۔ مذکورہ بالا چند احادیث سے یہ بات ضرور روشن ہوگئی کہ گستاخ کی سزا قتل ہے خواہ پہلی قسم کا گستاخ ہو یعنی کافر اصلی یا دوسری قسم کا گستاخ یعنی مرتد (جو اسلام لانے کے بعد یعنی مسلمان کہلانے کے باوجود آپ ﷺ کی گستاخی کرے) سب قتل کے سزاوار ہیں۔

اب غور کریں کہ مولانا وحید الدین خان کا یہ جملہ کہاں تک درست ہے " اس کتاب میں ابن تیمیہ نے شاتم رسول کے لیے قتل کی سزا بتائی ہے صرف اس لیے کہ فقہا نے بعد کے زمانے میں یہ حکم وضع کیا کہ شاتم کو بطور سزا قتل کیا جائے گا۔۔۔ الخ"

☆ کیا یہ حکم فقہا نے بعد کے زمانے میں وضع کیے یا حضور ﷺ کے زمانے سے یہی حکم چلا آرہا ہے؟

☆ کیا وحید الدین خاں صاحب کی بات رسول اکرم ﷺ اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور دیگر علمائے کرام کی بات پر فوقیت رکھتی ہے؟ ہرگز نہیں۔ یہ بکواس یا تو موصوف کی کم علمی کا نتیجہ ہے یا خبث باطن کا اظہار۔

ہم تو یہ یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ یہ ان کی باطنی خباثت ہے کیوں کہ یہ کوئی اتفاق نہیں بلکہ ان کی تحریر میں جابجا اس قسم کی باتیں نئے انداز میں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ آئیے اب ہم ایک دوسری تحریر پیش کرتے ہیں:

"حدیث کی مختلف کتابوں میں ایک روایت آتی ہے۔ صحیح البخاری کے الفاظ یہ ہیں: لا تطرونی کما اطرت النصاری ابن مریم، فإنما أنا عبده فقولوا عبد الله ورسوله. (صحیح البخاری حدیث:۳۴۴۵) یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میری تعریف میں مبالغہ نہ کرو جیسا کہ نصاریٰ نے ابن مریم کی تعریف میں مبالغہ کیا، میں تو صرف اللہ کا ایک بندہ ہوں، تم صرف یہ کہو: اللہ کا بندہ اور اس کا رسول۔" (الرسالہ اگست ۲۰۱۵ء ص:۹)

اس حدیث مبارکہ کو ذکر کرنے کے بعد جناب نے اس کی تشریح کی ہے قبل اس کے کہ ان کی تشریح کو ملاحظہ کریں اس حدیث کا صحیح منشا و مطلب ملاحظہ کریں:

سرکار دوجہاں ﷺ نے فرمایا: اے لوگو! تم میرے ساتھ وہ معاملہ نہ کرنا جو

نصاریٰ نے عیسیٰ ابن مریم کے ساتھ کیا۔ نصاریٰ نے کیا کیا تھا؟ قرآن کہتا ہے: وَ قَالَتِ النَّصٰرَی الْمَسِیْحُ ابْنُ اللّٰهِ [1] (اور نصاریٰ نے کہا مسیح اللہ کے بیٹے ہیں) لہٰذا حضور ﷺ نے اپنی امت کو تنبیہ فرمادی کہ ہرگز تم مجھے اللہ کا بیٹا نہ بنانا جیسا کہ نصاریٰ نے عیسیٰ ابن مریم کو اللہ کا بیٹا بنادیا۔

یوں ہی نصاریٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو تین خداؤں میں سے ایک خدا مانتے تھے جیسا کہ قرآن پاک میں ہے: لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ [2] یعنی بے شک کافر ہیں وہ جو کہتے ہیں کہ اللہ وہی مسیح، مریم کا بیٹا ہے۔ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ [3] یعنی بے شک کافر وہ جو کہتے ہیں کہ اللہ تین خداؤں میں تیسرا ہے۔

تو سرکار دو جہاں علیہ التحیۃ والثنا نے اپنی امت کو یہ ہدایت فرمائی کہ تم مجھے خدا یا خدا کا بیٹا ہرگز نہ بنانا جیسا کہ نصاریٰ نے مسیح ابن مریم علیہما السلام کو خدا اور خدا کا بیٹا بنادیا بلکہ میں تو اللہ کا بندہ ہوں اور ہاں یاد رہے کہ میری شان میں نازیبا کلمات نہ بکنا کیوں کہ میں اللہ کا رسول ہوں یعنی نہ اتنی تعریف کرنا کہ خدا بنادو اور نہ مجھے میرے منصب رسالت سے گھٹانے کی کوشش کرنا۔

الحمد للہ ہم اہل حق زمانۂ صحابہ سے لے کر اب تک نہ سرکار علیہ السلام کی مدح سرائی میں نصاریٰ کی طرح مبالغہ کرتے ہیں اور نہ ہی آپ کی تعریف و توصیف میں کوئی کسر باقی رکھتے ہیں۔ ع

"بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر"

اب موصوف کی تحریر ملاحظہ کریں:

"اطراء کا مطلب ہے مبالغہ آمیز مدح خوانی (To praise highly)

امت جب اپنے پیغمبر کے بارے میں اطراء کی روش میں مبتلا ہوجائے تو

---

(۱)- التوبۃ: ۳۰

(۲)- المائدۃ: ۷۲

(۳)- المائدۃ: ۷۳

امت کے افراد کے اندر یہ ذہن بنتا ہے کہ پیغمبر کے بارے میں ہمارا کام یہ ہے کہ اس کی مبالغہ آمیز نعت خوانی کریں، اس کے نام کے ساتھ بڑے بڑے القاب شامل کریں، پیغمبر کی اس طرح قصیدہ خوانی کریں جس طرح پہلے زمانے میں بادشاہوں کی قصیدہ خوانی کی جاتی تھی۔ اس اطراء کا ایک ظاہرہ یہ ہے کہ امت کے افراد اپنے پیغمبر کے بارے میں بہت زیادہ حساس ہوجاتے ہیں۔ ان کے خیال کے مطابق اگر کوئی شخص پیغمبر کی ذات کے معاملے میں گستاخی کا کلمہ کہہ دے تو وہ بھڑک اٹھیں گے اور چاہیں گے کہ ایسے آدمی کو قتل کر ڈالیں۔ ایسے لوگ اپنے پیغمبر کے بارے میں جو کتابیں لکھیں گے ان میں شاعرانہ مبالغہ آرائی تو بہت ہوگی لیکن علمی اور تاریخی مواد ان کے اندر بہت کم پایا جائے گا۔" (الرسالہ اگست ۲۰۱۵ ص:۹)

موصوف نے اطراء اور مبالغہ آمیز مدح خوانی کی کوئی مثال پیش نہیں کی کہ ہم بھی سمجھ لیتے کہ مبالغہ آمیز مدح خوانی کسے کہتے ہیں؟ لیکن مولانا نے دو جملوں کے ذریعے اسے اشارۃً بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔

**پہلا جملہ:** "اس (یعنی پیغمبر) کے نام کے ساتھ بڑے بڑے القاب شامل کرنا" اس سے سمجھ میں آتا ہے کہ بڑے بڑے القاب بیان کرنا اطراء اور مبالغہ آمیز مدح خوانی ہے۔ تو اب ہم چند القاب اور کچھ توصیفی کلمات کا ذکر کرتے ہیں:

① رحمۃ للعالمین (سارے جہانوں کے لیے رحمت) ② قاسم رزق اللہ (اللہ کے رزق کو بندوں میں بانٹنے والے) ③ باعث تخلیق عالم (دنیا اور جو کچھ دنیا میں ہے سب کی تخلیق و پیدائش کا سبب اصلی کہ اگر وہ نہ ہوتے تو کچھ بھی نہ ہوتا) ④ خیر خلق اللہ (اللہ کی مخلوق میں سب سے بہترین) ⑤ شافع یوم النشور (قیامت کے دن شفاعت کرنے والے) ⑥ إمام الانبیاء (سب سے بہترین لوگوں یعنی نبیوں کے سردار و پیشوا) ⑦ نور من نور اللہ (اللہ کا نور) ⑧ دافع البلاء (بلاؤں کو دفع کرنے والے) ⑨ صاحب معطر پسینہ کہ کوئی مشک آپ کے پسینے سے زیادہ خوشبودار نہیں ⑩ کوئی ریشم آپ کے دست اقدس کی طرح نرم و گداز نہیں ⑪ اے چودھویں کے چاند سے زیادہ حسین و جمیل ⑫ آپ کا چہرہ چاشت کے وقت

سورج کی مانند ہے ⑬ آپ کی زلفیں رات کی طرح سیاہ ہیں ⑭ غیب کی خبریں بتانے والے ⑮ ساتوں آسمان، عرش و کرسی پار کر کے اللہ رب العزت کا دیدار ماتھے کی آنکھوں سے کرنے والے۔

کیا یہ اطراء اور مبالغہ آمیز مدح خوانی ہے؟ کیوں کہ یہ اتنے بڑے بڑے القاب ہیں کہ ان سے بڑے القاب اور توصیفی جملے نظر نہیں آتے۔ اگر یہ اطراء اور مبالغہ آمیز نعت خوانی نہیں تو پھر وہ کون سے القاب ہیں جنھیں مولانا نے اطراء سمجھا۔

اور اگر مذکورہ بالا القاب اطراء ہیں تو پھر بتائیں کہ ان آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ کا کیا کریں گے جن میں یہ القاب موجود ہیں۔ ان میں سے شاید ہی کوئی ایسا ہو جس کا ذکر قرآن مجید یا پھر حدیث میں نہ ہو۔

**دوسرا جملہ:** ''پیغمبر کی اسی طرح قصیدہ خوانی کرنا جس طرح بادشاہوں کی کی جاتی تھی۔''

اس سے سمجھ میں آتا ہے کہ بادشاہوں کی طرح قصیدہ خوانی بھی اطراء ہے حالاں کہ بادشاہوں سے کہیں زیادہ تعریف و توصیف کے حقدار ہمارے آقا پیارے پیغمبر ﷺ ہیں۔ بادشاہوں کی تو جھوٹی تعریف کی جاتی تھی لیکن سرکار علیہ السلام تو تمام کمالات کے جامع ہیں تو ان کی جتنی تعریف کی جائے وہ کم ہے۔ لہٰذا ہم جو بھی تعریف کریں وہ کما حقہ ان کی تعریف نہیں چہ جائے کہ مبالغہ اور غلو کا تحقق ہو۔ چناں چہ صلح حدیبیہ کے موقع سے جب کفار مکہ کے سفیر نے صحابۂ کرام کو نبی کریم ﷺ کی تعظیم کرتے ہوئے دیکھا تو بولا میں نے قیصر و کسریٰ کی بارگاہوں کا مشاہدہ کیا ہے لیکن میں نے محمد ﷺ کے اصحاب کی طرح مؤدب کسی درباری کو نہ پایا کہ جب محمد ﷺ ناک سے پانی نکالتے ہیں تو ان کے اصحاب اسے اپنے چہروں پر مل لیتے ہیں وغیرہ۔

اب بتائیں ایسے عشاق جب اپنی پیغمبر کی تعریف کریں گے تو کیا ہی خوب کریں گے چناں چہ صحابہ نے جو تعریف اپنے نبی ﷺ کی کی ہے ویسی کسی بادشاہ کی نہیں کی۔

آخر میں جناب نے لکھا کہ ''اس قسم کی مدح خوانی سے امت کے افراد اپنے پیغمبر کے بارے میں بہت زیادہ حساس ہو جاتے ہیں اور ان کے خیال کے مطابق اگر کوئی شخص پیغمبر کی ذات کے معاملے میں گستاخی کا کلمہ کہہ دے تو وہ بھڑک اٹھیں اور چاہیں کہ ایسے آدمی کو

قتل کر ڈالیں۔"

موصوف کے کہنے کا مطلب صاف ظاہر ہے کہ امت کا اس طرح حساس ہونا اور گستاخ کی گستاخی پر بھڑک اٹھنا درست نہیں (نعوذ باللہ من ذلک) حالاں کہ یہ تو ایمان کی پختگی اور حرارت کی دلیل ہے جو سچے مسلمانوں کو صحابۂ کرام سے وراثت میں ملی ہے۔ آئیے حدیث پاک ملاحظہ کیجیے:

(۱)-عن أبي سعيد الخدري قال: بين النبي ﷺ يقسم ذات يوم قسما فقال ذو الخو يصرة رجل من بني تميم: يارسول الله اعدل! قال: و يلك! من يعدل إذا لم أعدل؟ فقال عمر: ائذن لي فلأضرب عنقه، قال: لا. (۱)

**ترجمہ:** حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے انھوں نے فرمایا کہ ایک روز حضور ﷺ مال غنیمت تقسیم فرما رہے تھے تو ذوالخویصرہ نامی شخص- جو کہ بنی تمیم سے تھا- نے کہا: اے اللہ کے رسول! انصاف کیجیے، آپ ﷺ نے فرمایا: تو ہلاک ہو، اگر میں انصاف نہ کروں تو اور کون انصاف کرے گا؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا مجھے اجازت دیں کہ اس کی گردن اڑا دوں، آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں۔

(۲)- ایک حدیث پاک میں ہے کہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یمن سے حضور ﷺ کی بارگاہ میں سونا بھیجا تو آپ علیہ السلام نے اسے چار لوگوں میں تقسیم فرما دیا۔ ایک شخص نے کہا اے اللہ کے رسول! اللہ سے ڈریں، آپ ﷺ نے فرمایا: تو ہلاک ہو، کیا میں تمام اہل زمین سے زیادہ خدا سے ڈرنے کا مستحق نہیں ہوں؟ تو جب وہ آدمی جانے کے لیے مڑا تو خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یا رسول الله ألا أضرب عنقه؟ (یارسول اللہ! کیا میں اس کی گردن نہ اڑا دوں؟) فرمایا: نہیں۔

(۳)-وفي رواية أبي نعيم: فقال: يا محمد! اتق الله واعدل، فقال رسول الله ﷺ يأمنني أهل السماء ولا تأمنوني؟ فقال أبو بكر: اضرب رقبته يارسول الله؟ قال: نعم، فذهب فوجده يصلي فجاء النبي ﷺ فقال وجدته يصلي فقال آخر: أنا أضرب عنقه؟(رواه أبو نعيم في مسند المستخرج علىٰ صحيح

(۱)-صحیح البخاری: ج:۲، ص:۹۱۰ کتاب الأدب، باب ماجاء فی قول الرجل و یلك.

الإمام المسلم)

**ترجمہ:** اور حضرت ابو نعیم کی ایک روایت میں ہے کہ اس (منافق) نے کہا اے محمد! (ﷺ) اللہ سے ڈرو اور انصاف کرو تو رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: آسمان والوں کے نزدیک میں امانت دار ہوں تم مجھے امین نہیں سمجھتے؟ تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! میں اس کی گردن اڑادوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں، سو وہ گئے تو اسے نماز پڑھتے ہوئے پایا تو حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کیا: میں نے اسے نماز پڑھتے ہوئے پایا (اس لیے قتل نہیں کیا) تو کسی دوسرے صحابی نے عرض کیا: کیا میں اس کی گردن کاٹ دوں؟

(۴)- حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ میری آنکھوں نے دیکھا اور کانوں نے رسول اللہ ﷺ کو مقام جعرانہ میں فرماتے ہوئے سنا جب کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے کپڑوں (گود) میں چاندی تھی اور حضور ﷺ اس میں سے مٹھیاں بھر بھر کے لوگوں کو عطا فرما رہے تھے، تو ایک شخص نے کہا: عدل کرو، آپ نے فرمایا: تو ہلاک ہو، اگر میں عدل نہیں کروں گا تو کون عدل کرے گا؟ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! دعنی أقتل هذا المنافق الخبيث فقال رسول الله ﷺ معاذ الله أن يتحدث الناس عني أقتل أصحابي. (یا رسول اللہ! مجھے اس خبیث منافق کو قتل کرنے دیں تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: میں لوگوں کے اس قول سے کہ میں اپنے ساتھیوں کو قتل کرنے لگ گیا ہوں- اللہ کی پناہ چاہتا ہوں-)

مذکورہ بالا احادیث کے مطالعے سے یہ بات بخوبی واضح ہوتی ہے کہ گستاخ کی گستاخی پر بھڑک اٹھنا اور اسے قتل کرنے کا ارادہ کرنا ایمان کی علامت اور صحابۂ کرام کی سنت ہے۔ لیکن وحید الدین صاحب نے اسے غلط بتا کر نہ صرف صحابۂ کرام کے فعل کو غلط کہا بلکہ گستاخوں کی پیٹھ پر تھپکیاں دی ہیں کہ تم گستاخیاں کرو اور میری فکر کو مسلمانوں کے حملے سے بچنے کے لیے ڈھال بنالو۔ العیاذ باللہ۔

خبردار! مذکورہ احادیث سے کوئی دھوکے میں نہ ڈالے کہ صحابۂ کرام نے تو چاہا کہ قتل کردیں لیکن سرکار علیہ السلام نے تو اس سے منع فرمایا۔ اس سے سمجھ میں آتا ہے کہ صحابہ

کا یہ فعل نامناسب تھا۔ حاشا اللہ۔ ہر گز ہر گز ایسا نہیں، وہ منع کرنا تو سرکار علیہ السلام کی بردباری تھی ورنہ مذکورہ بالا حدیث نمبر ۳ میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے کی بھی اجازت ملی ہے، اور جہاں سرکار صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا وہاں اس کی وجہ بھی بیان کردی کہ کہیں پیغمبر اسلام کے متعلق بدگمانی نہ پھیل جائے کہ وہ اپنے اصحاب کو قتل کرتے ہیں۔ پھر قابل غور یہ بات بھی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فقط قتل سے منع فرمایا، یہ نہ فرمایا کہ تم اس طرح گستاخ کی گستاخی پر نہ بھڑکا کرو۔

اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے دلوں میں اپنی اور اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت سلامت رکھے اور گستاخوں کے وجود سے روے زمین کو پاک کرنے کی توفیق دے۔ ارے! کیوں نہ بھڑکیں؟ اگر کوئی تمھارے باپ کی بے حرمتی کرے تو تمھارا خون جوش مارنے لگے اور تمھارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو گالیاں دے تو تمھارے کانوں پر جوں تک نہ رینگے۔ مسلمانو! تمھارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں: لا یؤمن أحدکم حتیٰ أکون أحب إلیه من والده وولده والناس أجمعین [1] (یعنی تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک میں اس کے نزدیک اس کے باپ، بیٹے اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہوجاؤں۔ وفي روایة: "والذي نفسي بیده حتیٰ أکون أحب إلیك من نفسك [2]

اور ایک روایت میں ہے: اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے (تم اس وقت تک مومن کامل نہیں ہوسکتے) یہاں تک میں تمھارے نزدیک تمھاری جان سے بھی زیادہ محبوب نہ ہوجاؤں۔

لہٰذا مسلمانو! تمھارا عشق رسول تمھیں مبارک ہو! اس باب میں کسی منافق کی بات کی جانب التفات کی تمھیں کوئی ضرورت نہیں اور نہ ہی تمھارے لیے حلال ہے کہ تم ایسوں کی کتابیں پڑھو یا تقریریں سنو۔ واللہ الموفق لکل خیر.

بہر حال اب مضمون نگار کی اگلی کارستانی ملاحظہ کریں۔ آگے مولانا نے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رضی اللہ عنہ کی مشہور ترین کتاب "حجۃ اللہ البالغۃ" پر بھی کلام کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

(۱)- رواه البخاري کتاب الإیمان، باب حب الرسول صلی اللہ علیه وسلم من الإیمان. ج:۱، ص:۷

(۲)-أیضًا، في کتاب الأیمان والنذور، باب کیف کان یمین النبي صلی اللہ علیه وسلم ج:۱، ص: ۹۸۱

”اس کتاب کا ٹائٹل بظاہر قرآن کی ایک آیت سے ماخوذ ہے مگر عملاً یہ کتاب قرآنی پیٹرن پر نہیں لکھی گئی بلکہ فقہی پیٹرن پر لکھی گئی ہے۔“

نہ جانے مولانا کے ذہن میں کیسا فتور داخل ہوگیا ہے یاکسی سرکش عفریت (بھوت) نے گھر کر لیا ہے کہ ہمیشہ اسلاف کی تنقید لایعنی میں لگے رہتے ہیں حالاں کہ فقہی پیٹرن قرآن و حدیث کے پیٹرن سے جداگانہ نہیں بلکہ قرآن و حدیث ہی کا ماحصل ”فقہ“ کہلاتا ہے کیوں کہ قرآن و حدیث میں وضوو غسل، نماز وزکوٰۃ، حج و قربانی، حدود و قصاص، نکاح وطلاق، عاریت وودیعت، ہبہ و صدقہ، کفالت وو کالت، ایمان و حدود، قتال و تعزیر اور رباح و مرابحہ وغیرہ سیکڑوں قسم کے مسائل بیان کیے گئے ہیں اور ”علم فقہ“ میں بھی یہی چیزیں وضاحت کے ساتھ بیان کی جاتی ہیں تاکہ ہر شخص نفس مسئلہ بآسانی سمجھ جائے اور جس مسئلے کی تفصیل نہیں ملتی اس پر مفصل بحث سامنے آجائے۔ یہی مجتہدین کا اصل کام ہے۔ اور یہ کوئی آسان کام نہیں اور نہ ہر کس وناکس کا کام ہے۔

آگے وحید الدین صاحب نے انور شاہ کشمیری کا ایک قول نقل کیا کہ حدیث ”الحلال بين والحرام بين“ کو سمجھنے کے لیے انھوں نے حدیث کی تمام متداول شرحیں چھان ڈالیں مگر انھیں لفظی تشریح کے علاوہ اور کچھ حاصل نہ ہوا تو انور شاہ کشمیری نے کہا: ”لم يتحصل عندنا منه شيء غير حل الألفاظ“ (یعنی حل الفاظ کے سوا مجھے اور کچھ نہ ملا)

انور شاہ کشمیری کے اس تبصرے (جو کہ صرف ایک حدیث کی تشریح سے متعلق تھا) حدیث کی تمام شرحوں پر چسپاں کر دیا، چناں چہ موصوف لکھتے ہیں:

”علامہ انور شاہ کشمیری کا یہ تبصرہ حدیث کی تمام شرحوں پر صادق آتا ہے۔“

(الرسالہ اگست ۲۰۱۵ ص:۱۷)

جس حدیث کی تشریح انور شاہ کشمیری حدیث کی متداول شروحات میں تلاش رہے تھے اس کی معنوی تشریح شرحوں میں ہے یا نہیں اس سے صرف نظر اگر بر سبیل تنزل مان بھی لیں کہ اس حدیث کی تشریح شروحات میں نہیں تو اس سے کہاں ثابت ہوتا ہے کہ تمام شرحوں میں ہر ہر حدیث کی صرف لفظی تشریح (حل لغات) کی گئی ہے۔ اب اگر کوئی نہ مانے تو

وہ حدیث کی شرحوں کا مطالعہ کرلے پھر بھی اگر اپنی ضد پر اڑا رہے تو دن میں چمگادڑ کو سورج نظر نہ آنا سورج کی کمی پر دلالت نہیں کرتا۔

## مولانا وحید الدین کی حدیث سے ناواقفیت

آں جناب مسح علی الخفین کی بحث چھیڑتے ہوئے امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کو کچھ اس طرح تنقید کا نشانہ بناتے ہیں:

"اس شرعی مسئلے کے بارے میں امام ابو حنیفہ (وفات ۷۶۷ء) کہتے ہیں:" دین کی بنیاد اگر رائے (عقل) پر ہوتی تو میں کہتا کہ پاؤں کے نیچے سے مسح کیا جائے نہ کہ پاؤں کے اوپر سے۔"

امام ابو حنیفہ کا یہ قول صرف اس لیے ہے کہ انھوں نے اس معاملے میں حدیث رسول کو محض الفاظ کے اعتبار سے لیا۔ انھوں نے اس حدیث رسول پر عقلی اعتبار سے غور نہیں کیا۔ اگر وہ اس حکم پر غور کرتے تو کہتے کہ مسح علی الخفین وضو کا بدل نہیں ہے بلکہ وہ وضو کی علامت ہے۔ آدمی جب موزے کے اوپر مسح کرتا ہے تو وہ علامتی طور پر وضو کے حکم کی تعمیل کرتا ہے اور جب وہ علامتی ہے تو یہ بات اضافی ہوجاتی ہے کہ پاؤں کی کس سمت سے مسح کیا جائے۔(الرسالہ اگست ۲۰۱۵ص:۱۶)"

موصوف نے سید الفقہا والمحدثین امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کے قول کو مرجوح بلکہ غلط اور خود اپنے قول کو راجح اور صحیح قرار دینے اور امام اعظم کی عقل کو تولنے کی جو ناکام کوشش کی ہے اس کا جواب دینا کیچڑ پر پتھر مارنے کے مترادف ہے تاہم یہ بتادوں کہ وہ قول ثانیاً امام اعظم کا تو ہوسکتا ہے مگر اولاً وہ قول حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کا ہے۔ چناں چہ حضرت ابو داؤد سلیمان بن اشعث سجستانی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب "سنن ابی داؤد" (جو کہ صحاح ستہ میں سے ایک ہے) میں روایت نقل کرتے ہیں:

حدثنا محمد بن العلاء قال ثنا حفص يعني ابن غياث عن الأعمش عن أبي إسحق عن عبد خير عن علي رضى الله عنه قال: لو كان الدين بالرائ لكان أسفل الخف أولىٰ بالمسح من أعلاه وقد رأيت رسول الله ﷺ يمسح على

ظاهر خفيه.[1]

حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم سے مروی ہے فرماتے ہیں: دین کی بنیاد اگر رائے (عقل) پر ہوتی تو خف (چمڑے کا موزہ) کے نیچے مسح کرنا اولیٰ (بہتر) ہوتا اوپر مسح کرنے سے اور یقیناً میں نے رسول کریم علیہ الصلوۃ والتسلیم کو اپنے خفین کے اوپر ہی مسح کرتے ہوئے دیکھا ہے۔

اور ایک دوسری حدیث میں ہے:

لو كان الدين بالرائ لكان باطن القدمين أحق بالمسح من ظاهرهما وقد مسح النبي ﷺ على ظهر خفيه. (أيضًا)

یعنی اگر دین کی بنیاد عقل پر ہوتی تو دونوں پاؤں (کے موزے) کے نیچے مسح کرنا دونوں کے اوپر مسح کرنے سے زیادہ حقدار ہوتا حالاں کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے خفین کے اوپر ہی مسح فرمایا ہے۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ امام اعظم رضی اللہ عنہ کا قول حدیث کے عین مطابق اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قول کے مترادف ہے بلکہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی کا قول ہے۔ لہٰذا اس قول کی وجہ سے امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کو جو کچھ بھی کہا جائے گا وہ سب حضرت علی رضی اللہ عنہ پر واقع ہوں گے۔ تو اب ہم مولانا وحید الدین خاں سے کہتے ہیں کہ اب حضرت علی رضی اللہ عنہ پر اپنے جملے چست کیجیے، پھبتیاں کسیے اور کہیے کہ ”حضرت علی کا یہ قول صرف اس لیے ہے کہ انھوں نے اس معاملے

میں حدیث رسول کو محض الفاظ کے اعتبار سے لیا۔ انھوں نے حدیث (طریقۂ رسول ﷺ) پر عقلی اعتبار سے غور نہیں کیا، اگر وہ (علی) اس حکم پر غور کرتے تو کہتے کہ مسح علی الخفین وضو کا بدل نہیں (اے علی! آپ کی فہم غلط ہے) بلکہ وہ وضو کی علامت ہے۔“ (نعوذ باللہ من ذلک)

قارئین! بزرگوں سے اختلاف کرنے اور خصوصاً خیر القرون (اسلام کے پہلے تین دور) کے اسلاف پر طعن وتشنیع کا یہی انجام ہوتا ہے۔ آپ نے اب تک کی تحریر سے مولانا وحید الدین کی حدیث سے ناواقفیت اور حدیث دانی کا اندازہ لگا لیا ہوگا۔ یہ صرف مولانا کی

(۱)–أبو داؤد: كتاب الطهارة، باب كيف المسح ص: ۲۲. المكتبة الأشرفية.

ایک مختصر سی تحریر کی آزاد خیالی کا حال ہے تو خود اندازہ لگائیں کہ مولانا کی زندگی کی تمام تحریروں کا عالم کیا ہو گا۔ ان میں کتنی گمراہ کن چیزیں ہوں گی؟

## خلاصۂ کلام

وحید الدین خاں صاحب نے جو یہ مضمون بنام "فتنۂ دہیما: فکری کنفیوژن" لکھا ہے اس سے ان کا مقصد مندرجہ ذیل نظریات کی نشر و اشاعت ہے:

- علم فقہ فتنۂ دہیما یعنی فکری کنفیوژن ہے کیوں کہ یہ قرآنی پیٹرن کے مخالف ہے۔
- علم فقہ اور فقہا کی مسلمان ہرگز اتباع نہ کریں بلکہ خود سے قرآن و حدیث سے احکام کا استنباط کریں۔
- دوسری صدی سے اب تک دینی موضوعات (حدیث، فقہ، تفسیر اور تصوف وغیرہ) پر جتنی کتابیں لکھی گئیں ان سے استفادہ نہ کیا جائے بلکہ انھیں لائبریریوں میں کلاسکل لٹریچر کی حیثیت سے محفوظ کر دیا جائے کہ اسلام کی شرح کے اعتبار سے ان کی مستند حیثیت باقی نہ رہے۔
- علم فقہ میں ہونے والے اختلافات، اسلامی اسپرٹ کے فقدان کی وجہ سے پائے گئے اور یہی اختلاف حقیقت میں فتنہ ہے۔
- صاحب مذہب حنفی امام اعظم ابو حنیفہ تابعی رضی اللہ عنہ احادیث و آثار کو نہیں سمجھتے تھے۔
- شاتم رسول (حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو گالی دینے والے) کی سزا قتل نہیں ہونی چاہیے۔ یوں ہی جب کسی مسلمان کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی گستاخی کی جائے تو وہ خاموش بیٹھے تماشا دیکھتا رہے، ایسے موقع سے گستاخ پر بھڑکنا بھی نہ چاہیے چہ جائے کہ اسے قتل کرنے کا ارادہ کرے۔

قارئین! ہم نے مولانا وحید الدین کے ان تمام گمراہ کن نظریات کو دلائل و براہین سے باطل و لغو قرار دیا جیسا کہ آپ نے ملاحظہ کیا کہ علم فقہ فکری کنفیوژن نہیں بلکہ کنفیوژن اور خلجان کو ختم کرنے والا ہے اور یہ علم **فتنۂ دہیما** نہیں بلکہ **نعمت عظمیٰ** ہے۔ اور یہ نعمت اسی کو ملتی ہے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے۔ جیسا کہ حدیث پاک میں وارد ہے: "من یرد اللہ بہ خیرا یفقھہ في الدین" (بخاری) یعنی اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ خیر کا

ارادہ فرماتا ہے اسے فقہ دینی عنایت فرماتا ہے۔

یوں ہی آپ نے ملاحظہ کیا کہ فقہی اختلافات اسلامی اسپرٹ کے فقدان کی وجہ سے نہیں کیوں کہ یہ اختلافات صحابہ کرام کے درمیان بھی پائے جاتے تھے اور صحابۂ کرام کا دور تو اسلامی اسپرٹ کے شباب کا دور تھا، لہٰذا ان فقہی اختلافات کو "فتنہ" ہرگز نہیں کہا جا سکتا بلکہ یہ اختلافات تو رحمت ہیں جیسا کہ حدیث میں آیا ہے: "اختلاف أمتي رحمة" یعنی میری امت (کے علما کا فقہا کا اختلاف) رحمت ہے۔

ان اختلافاتِ فرعیہ کا دور صحابہ میں پایا جانا ہی مولانا وحید الدین کے اس نظریے کو باطل کرنے کے لیے کافی ہے کہ انھوں نے کہا: " علم فقہ قرون اولیٰ کے بعد کی پیداوار ہے۔" پھر ترجمان القرآن صحابیٔ رسول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا "کُونُوْا رَبّٰنِیّٖنَ "( اللہ والے ہو جاؤ) سورۂ آل عمران: ۷۹ کی تفسیر میں یہ کہنا: "کونوا ربانیین حکماء علماء فقهاء" جہاں فقہا کی شان رفیع کا پتہ دیتا ہے وہیں مولانا وحید الدین کے نظریے کو بھی باطل کرتا ہے، علاوہ ازیں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کا فقہ و اجتہاد، احادیث کریمہ سے نہ صرف ثابت بلکہ مشہور و معروف ہونا اور سیدنا عمر فاروق کا ہزاروں نو پید مسائل فقہیہ کا حل کرنا بھی اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ علم فقہ کوئی نئی پیداوار نہیں۔

جہاں تک رہی بات دینی موضوعات پر لکھی جانے والی کتابوں سے استفادہ کرنے کی تو اس کے بارے میں صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ خود مولانا وحید الدین کی تحریریں بھی ان کتابوں کے استفادے سے خالی نہیں ہوتی ہیں بلکہ اپنی باتوں پر وہ خود انھیں کتابوں کو دلیل بناتے ہیں۔

راوی حدیث حضرت سفیان بن عیینہ کا یہ قول "الحديث مضلة إلا للفقهاء" یعنی حدیث فقہا کے علاوہ کو گمراہ کر دیتی ہے۔ (یعنی جب ہر کس و ناکس احادیث کو اپنے دماغ کے مطابق سمجھنے کی کوشش کرے اور مسائل نکالنے کی سعی کرے تو گمراہی لازمی ہے۔)

یوں ہی حدیث کی مشہور کتاب "جامع الترمذی" (جو صحاح ستہ میں سے ایک ہے) میں مذکور امام ترمذی کا یہ قول "الفقهاء وهم أعلم لمعاني الحديث" یعنی فقہاے

کرام ہی احادیث کے معانی کو خوب جانتے ہیں۔ یوں ہی راوئ احادیث محدث جلیل اور عظیم تابعی امام اعمش رضی اللہ عنہ کا امام اعظم سے یہ کہنا کہ "يا معشر الفقهاء أنتم الأطباء ونحن الصيادلة وأنت أيها الرجل أخذت بكلا الطرفين" (یعنی اے گروہ فقہا! تم ڈاکٹر ہو اور ہم محدثین دوافروش (میڈیکل اسٹور والے) کی طرح ہیں اور اے شخص (امام اعظم) تم نے حدیث وفقہ دونوں حاصل کر لیے۔" امام الفقہا والمحدثین امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کی فقاہت اور حدیث دانی کی بیّن دلیل ہے۔ اب اس کے باوجود مولانا وحید الدین کا یہ کہنا کہ "امام اعظم ابو حنیفہ احادیث کو نہیں سمجھتے تھے" بالکل بے اصل اور لغو ہے۔

شاتم رسول (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی گستاخی کرنے والے) کی سزا کے تعلق سے آپ نے کافی حدیثیں ملاحظہ کیں کہ اس کی سزا قتل ہی ہے۔ مختصر یہ کہ اللہ رب العزت احکم الحاکمین نے گستاخان رسول کے متعلق واضح حکم بیان فرمادیا: "لَا تَعْتَذِرُوْا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ ؕ" یعنی حیلے بہانے نہ بناؤ تم (گستاخئ رسول کے سبب) کافر ہو گئے اپنے ایمان لانے کے بعد۔ تو جب گستاخ کافر و مرتد ہوئے تو حدیث مبارکہ نے ان کی سزا سنادی کہ "من بدل دينه فاقتلوه"[1] یعنی جو اپنا دین بدل کر مرتد ہو جائے اسے قتل کر دو۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں جب منکرین زکوٰۃ کا گروہ نمودار ہوا تو صدیق اکبر نے ان سے جہاد کیا اور شب خون مار کر بہتوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور فرمایا کہ جو سرکار صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بکری کا ایک بچہ بھی زکوٰۃ کے طور پر دیتا تھا اور اب دینے سے انکار کرے تو میں اس سے جہاد کروں گا۔ تو اب بتائیں کہ اگر کسی نے اس ذات اقدس کی شان میں گستاخی کی ہوتی جس کی محبت کے بغیر ایمان مکمل نہیں ہوتا تو پھر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا اس کے ساتھ کیسا برتاؤ ہوتا؟ (اللہ ہی بہتر جانتا ہے)

اب مولانا وحید الدین خاں صاحب بتائیں کہ افضل البشر بعد الانبیا حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے منکرین زکوٰۃ کو دین کی دعوت حکیمانہ انداز میں کیوں نہیں دی؟ کیا وہ بھی آپ کے نزدیک غلطی اور خبط میں مبتلا تھے؟

---

(۱)۔ بخاری: ج:۱، ص:۴۲۳۔ مطبوعہ فاروقیہ بکڈپو، مٹیا محل دہلی

# ایک پیغام اہل حق کے نام

اے خوش عقیدہ مسلمانو! تم نے دیکھا کہ یہ نام نہاد شخص (وحید الدین خاں) کیسے گندے عقائد ونظریات کا حامل ہے اور ایسی بے تکی باتیں کرتا ہے جو نہ تو اس سے پہلے تم نے سنیں اور نہ تمھارے آباء واجداد نے اور نہ ہی دور صحابہ سے لے کر آج تک کسی مسلمان نے۔ تو جان لو کہ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں سرکار دو جہاں ﷺ نے تمھیں آگاہ فرمایا ہے کہ ان (وحید الدین جیسوں) سے بچتے رہو کہیں وہ تمھیں گمراہ نہ کردیں۔ چناں چہ حدیث پاک میں آیا ہے: عن رسول الله ﷺ أنه قال: سیکون في آخر أمتي أناس یحدثونکم بما لم تسمعوا أنتم ولا آبائکم فإیاکم وإیاھم.[1] یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میری امت کے آخری زمانے میں کچھ ایسے لوگ ہوں گے جو ایسی باتیں کریں گے جنھیں نہ تم نے سنا اور نہ تمھارے آباء واجداد نے تو خود ان سے دور رہو اور انھیں اپنے سے دور رکھو۔

ایک دوسری روایت میں ہے: ”فإیاکم وإیاھم لا یضلونکم ولا یفتنونکم.“[2] یعنی تم ان سے دور رہو اور انھیں خود سے دور رکھو، کہیں وہ تمھیں گمراہ نہ کر دیں اور فتنے میں نہ ڈال دیں۔

لہٰذا اے مسلمانو! تم پر لازم ہے کہ تم ان (وحید الدین خان وغیرہ) سے بچتے رہو اور اگر تمھارے پاس دین کا علم نہیں تو تم پر فرض ہے کہ ایسے گمراہ کن شخص کی کوئی کتاب یا رسالہ ہرگز نہ پڑھو کہ ان کتابوں کا پڑھنا تم پر حرام سخت حرام ہے ورنہ یاد رکھو ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھو گے اور تمھیں خبر بھی نہ ہوگی۔ وما علینا إلا البلاغ.

---

(۱)- صحیح مسلم: ج: ۱، ص: ۹

(۲)- صحیح مسلم: ج: ۱، ص: ۹

# تعارف مصنف

**نام و نسب:** محمد شہباز انور برکاتی بن الحاج مولانا جلال الدین نوری مصباحی بن محی الدین بن ثمیر الدین بن مظہر علی۔

**ولادت:** اندازے کے اعتبار سے ۱۹؍ رجب المرجب ۱۴۱۸ھ اور باعتبار سند ۱۰؍ جنوری ۱۹۹۸ء۔

**موطن:** گواباڑی چین پور (اس گاؤں کو فتنۂ اکبری سے بچنے کی خاطر چند علماے کرام نے دہلی سے آکر بسایا تھا، یہ علماے کرام فرنگی محل سے تعلیم یافتہ اور بہت ہی متبحر تھے۔ ان سے پہلے بھی یہاں کوئی آبادی تھی یا نہیں اس کا تو علم نہیں البتہ انھوں نے یہاں آکر چین کی سانس لی اور غالباً اس گاؤں کی وجہ تسمیہ بھی یہی ہے۔) **پوسٹ:** بربلّا، **تھانہ** گوال پوکھر، ضلع اتر دیناج پور (بنگال)

**تعلیم و تربیت:** اپنے گاؤں ہی میں دار العلوم انوار العلوم متّصل جامع مسجد چین پور میں قرآن اور اردو کی ابتدائی کتابیں پڑھیں، بعد ازاں والد گرامی کے ساتھ دار العلوم فیضان رسالت ملکی ضلع مالدہ میں رہ کر فارسی وغیرہ پڑھی، پھر جامعہ طیبۃ الرضا حیدر آباد پھر دار العلوم مدینۃ العلوم رتن پور کھیڑا گجرات، پھر اخیر میں الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور آئے۔

در حقیقت اشرفیہ سے پہلے محض پرائمری کی تعلیم حاصل کی اور باقاعدہ تعلیم کا آغاز الجامعۃ الاشرفیہ سے ہی ہوا اور تاوقت تحریر (۱۴۳۸ھ مطابق ۲۰۱۶ء) جماعت خامسہ میں جاری ہے۔

**الجامعۃ الاشرفیہ میں داخلہ:** ۱۷؍ شوال المکرم ۱۴۳۲ھ مطابق ۱۶؍ ستمبر ۲۰۱۱ء۔

**بیعت و ارادت:** ۲۰۱۲ء میں گل گلزار برکاتیت خلیفۂ مفتی اعظم ہند حضرت امین ملت پروفیسر سید محمد امین میاں قادری برکاتی مد ظلہ العالی صاحب سجادہ خانقاہ عالیہ قادریہ برکاتیہ مارہرہ مطہرہ ضلع ایٹہ (یوپی) سے الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور میں بیعت ہوئے۔

**اسناد:** سند مولوی و مقری ۱۴۳۷ھ مطابق ۲۰۱۵ء الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور اعظم گڑھ (یوپی)

مولوی، عالم، کامل اتر پردیش مدرسہ تعلیمی بورڈ لکھنؤ۔

**مشاغل:** تعلیم و تعلم، مضمون نگاری، شعر گوئی (اردو، فارسی اور عربی تینوں زبانوں میں)


بقلم

**محمد روح الامین برکاتی**

اتر دیناج پور (بنگال)

متعلم الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور اعظم گڑھ


۱۵/ اکتوبر ۲۰۱۶ء

# ادارۂ فلاح

## ایک تعارف

تنظیم ایک ایسا رابطہ ہوتا ہے جس سے بکھرے ہوئے افراد میں قربت پیدا ہوتی ہے، عملی مزاج کا ماحول سازگار ہوتا ہے، اس سے لوگوں میں فعالیت اور عملی فکر و توازن قائم ہوتا ہے، حرکت و عمل میں منصوبہ بندی آجاتی ہے جس کے نتائج بڑے سود مند ہوتے ہیں۔ اسی اہمیت کے پیش نظر ۲۰۱۷ء میں ''ادارۂ فلاح'' بیدول، بلرام پور، کٹیہار (بہار) کی بنیاد رکھی گئی ہے۔

**تنظیم کے چند اغراض و مقاصد:**

(۱)-عوام کے درمیان پھیلی برائیوں کا خاتمہ کرنا اور انھیں جادۂ مستقیم پر گام زن کرنا۔

(۲)-نسل نو کے خوابیدہ قلم کاروں کو منظر عام پر لانا۔

(۴)-طلبہ کے لیے '' الفلاح کوئز کمپٹیشن'' کا انعقاد کرنا۔

(۵)- موقع بہ موقع کتب و رسائل وغیرہ کی اشاعت کرنا۔

(۶)-مسلم غریب و نادار بچوں کے لیے اسکالرشپ فراہم کرنا۔

**رابطہ کریں:**


مولانا محمد کامل رضا مصباحی: 8009451892

مفتی راشد علیم مصباحی: 7379610972

مفتی عبدالوہاب قادری مصباحی: 8188925538